جلد ۸۸ ماہ محرم الحرام ۱۳۸۱ھ مطابق ماہ جولائی ۱۹۶۱ء عدد ۱

مضامین

خریداران معارف کی خدمت میں

آپ کے جس پتہ سے معارف روانہ کیا جاتا ہے، اگر اس میں کوئی تبدیلی یا ترمیم یا اضافہ یا کوئی غلطی ہوگئی ہو تو مہربانی کرکے صحیح پتہ سے مطلع فرمائیں تاکہ معارف وقت پر پہنچ جائے۔

منیجر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شذرات

ادھر کئی حلقوں سے مسلسل خطوط موصول ہوئے ہیں جن میں یہ دریافت کیا گیا ہے کہ دارالمصنفین اپنے پرانے علمی کاموں میں سے کن کن کاموں کو ختم کر چکا ہے، اور کون سے نئے کام اس کے پیش نظر ہیں، ان ہمدردوں کے معلومات کی خاطر عرض ہے کہ دارالمصنفین نے اپنی گذشتہ ۴۶ سال کی تاریخ میں مختلف علوم و فنون پر ۹۱ کتابیں شائع کی ہیں جو ۳۴۸۵۹ صفحات پر مشتمل ہیں، ان میں سیرۃ النبی کی چھ، صحابۂ کرام، تابعین و تبع تابعین پر چودہ، سوانح پر نو، ادب پر سترہ، تاریخ ہند پر بارہ، تاریخ اسلامی ممالک پر پندرہ، اجتماعیات پر دو، فلسفہ پر گیارہ اور مختلف علوم و فنون پر پانچ جلدیں ہیں، ان تصانیف کے علاوہ معارف ۱۹۱۶ء سے ہر مہینہ بڑی پابندی سے شائع ہوتا رہا ہے اور اب تک اس کی ۸۷ جلدیں نکل چکی ہیں، جو ۴۵۰۳۲ صفحات پر مشتمل ہیں اور اسوقت غالباً اردو کا سب سے قدیم ماہانہ علمی رسالہ ہے،
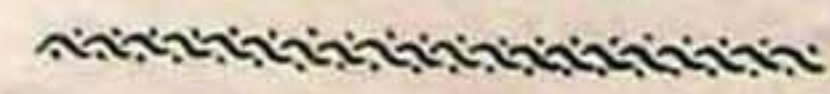
اس ادارہ کا سب سے بڑا کارنامہ سیرۃ النبی کی تدوین ہے، جو اسکی تمام مطبوعات میں سب سے زیادہ اہم اور مقبول ہے، اسکی مانگ ہندوستان، پاکستان اور بعض بیرونی ممالک سے برابر جاری ہے، اور اسکے ترجمے مختلف زبانوں میں اب تک ہو رہے ہیں، حضرت الاستاذ علامہ سید سلیمان ندویؒ کی وفات سے اسکی ساتویں جلد مکمل نہ ہو سکی، یہ سیاسیات پر مشتمل ہوتی، ان کے شاگردوں کو اسکو مکمل کرنے کی خواہش ضرور ہے لیکن حضرت الاستاذ کی تحقیق و تفتیش اور فکر و کاوش پیدا کرنا ممکن نہیں، اس لیے اب تک اس کام کو شروع نہیں کیا گیا ہے، پھر بھی "اسلام کا سیاسی نظام" پیش کر کے اسکی کچھ تلافی کرنے کی کوشش کی گئی ہے
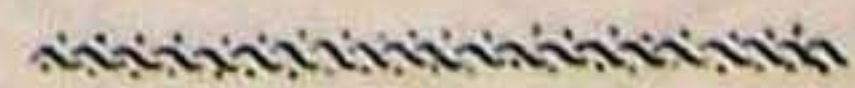
اس ادارہ کا دوسرا اہم کارنامہ صحابۂ کرام کے حالات کی ترتیب و تدوین ہے، یہ سلسلہ گیارہ جلدوں میں پھیل کر ختم ہو چکا ہے، ایسی کتابیں اپنی جامعیت اور استقصاء کے ساتھ اردو زبان تو درکنار عربی زبان میں بھی شاید نہیں ملینگی، صحابۂ کرام کے بعد تابعین پر کام شروع ہوا، اور یہ ختم ہوا تو تبع تابعین پر کام جاری ہے، اسکی پہلی جلد شائع ہو چکی ہے، اور دوسری جلد لکھی جا رہی ہے، جو جلد ہی شائع ہو جائیگی، ادارہ کا تیسرا اہم کارنامہ اسلامی ممالک کی تاریخ کا سلسلہ ہے، اسکی پندرہ جلدیں شائع ہو چکی ہیں، اس سلسلہ میں صرف تاریخ اندلس کی دوسری جلد کی اشاعت باقی رہ گئی ہے جس کے بعد یہ کام مکمل ہو جائیگا، ان تمام جلدوں کو بھی بڑا حسن قبول عطا ہوا ہے، اور یہ اتنی جامع اور مکمل سمجھی گئی ہیں کہ ہندوستان اور پاکستان کی مختلف یونیورسٹیوں اور درسگاہوں کے نصاب میں داخل ہیں، اسی طرح ادارہ کی ادبی کتابوں میں شعر العجم، گل رعنا اور شعر الہند کو بڑی مقبولیت حاصل ہے، ان تصانیف نے ملک و قوم کے ادبی ذوق کو از سر نو بنایا ہے، ادارہ کے پیش نظر ایک مبسوط تاریخ نثر اردو کی اشاعت بھی ہے جس کا کام ابھی تک شروع نہ ہو سکا ہے،
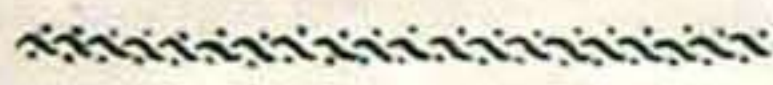
حضرت الاستاذ نے ادارہ کے علمی کاموں میں تاریخ ہند کی تدوین اور ترتیب بھی شامل کی تھی اور اس کی پندرہ جلدوں کا خاکہ دسمبر ۱۹۳۴ء کے معارف میں بھی پیش کیا تھا، اسوقت خیال تھا کہ ملک کے تمام اہل قلم اس اسکیم کی تکمیل میں تعاون کرینگے، لیکن ان سے مایوس ہو کر خود رفقائے دارالمصنفین نے اس کام کو انجام دینے کا بیڑا اٹھایا ہے، اور اب تک اس سلسلہ کی سات جلدیں شائع ہو چکی ہیں، دو اس سال بھی زیر طبع ہیں، اور تین کے مسودے تیار ہو چکے ہیں، پرانے کاموں میں یہی سلسلہ نامکمل ہے جس کو پورا کرنے کی ہر ممکن کوشش جاری ہے۔
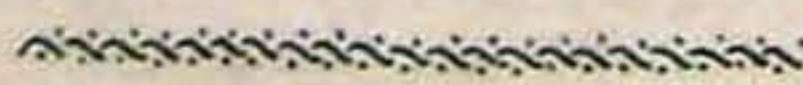
نئے علمی کام بھی جاری ہیں، تدوین قرآن مجید پر خاطر خواہ کام ہو چکا ہے، پھر "دین رحمت" کے نام سے ایک ایسی کتاب زیر تصنیف ہے جس سے یہ ظاہر ہوگا کہ اسلام دنیا کے لیے کس کس طرح باعث رحمت ہے، ممکن ہے کہ اسکی دو جلدیں ہوں، اسلام کے حکماء اور صوفیہ پر بہاں کام ہو چکا ہے، اب "ائمۂ اسلام" کے عنوان سے ان تمام ائمہ و

کے کاموں کا احاطہ کیا جارہا ہے جنھوں نے اپنے کارناموں سے مذہبی، روحانی علمی اور سیاسی انقلاب پیدا کیا، اسی طرح علمائے ہند کے مذہبی اور علمی کارناموں کو بھی ایک علحدہ جلد میں قلمبند کرنے کی ابتدا کردی گئی ہے، مثنوی مولانا روم پر ایک جامع کتاب کا مسودہ تیار ہے، جو بہت جلد چھپکر شائع ہوجائیگی، سیرت سلیمانی کا کام بھی جاری ہے اور اس کا بڑا حصہ لکھا جاچکا ہے، مقالاتِ سلیمانی کی ایک جلد کی ترتیب ہوچکی ہے، اسی طرح مکاتیب سلیمانی کا مسودہ بھی صاف ہوچکا ہے، انکے صرف چھپنے کی دیر ہے، مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم کے منتخب مقالات کی ترتیب بھی پیش نظر ہے۔

⁂⁂⁂

اس ادارہ کو ہر سال پرانی کتابوں کے نئے اڈیشن چھاپنے میں کافی سرمایہ لگانا پڑتا ہے، جس کے بعد وہ ہر سال دو نئی کتابوں سے زیادہ شائع کرنے سے قاصر ہوجاتا ہے، اسلیے مذکورۂ بالا نئی کتابوں کی اشاعت میں دیر ہورہی ہے، اگر ہماری مالی حالت بہتر ہوتی گئی تو ہر سال دو سے زیادہ نئی کتابوں کی اشاعت ممکن ہوجائیگی، ۱۹۴۷ء کے بعد ہم کو بہت ہی ناسازگار، حوصلہ شکن اور صبر آزما حالات سے گزرنا پڑا ہے، لیکن ہم خاموشی اور سکون سے کام کرنے کے عادی ہیں، اس لیے ہم نے اپنی گوناگوں مشکلات کو برسر عام لانا پسند نہیں کیا، اور رفتہ رفتہ ان پر قابو پارہے ہیں، ہماری پوری کوشش یہ ہے کہ ہمارا ادارہ خود کفیل ہوجائے تاکہ ہم مالی الجھنوں سے آزاد رہکر خاموشی سے اپنے علمی کاموں میں مشغول رہیں، خود کفیل بننے کی جتنی ممکن تدبیریں ہوسکتی ہیں ان کو عمل میں لانے کی کوشش جاری ہے، ہمارے اسٹاک میں اس وقت کتابوں کا کئی لاکھ کا سرمایہ ہے، اگر یہ برابر خاطر خواہ طریقہ پر فروخت ہوتی رہیں تو ہم آسانی سے خود کفیل ہوسکتے ہیں، لیکن ان کے خریداروں کا حلقہ زیادہ وسیع نہیں، اور ہماری مقبول ترین مطبوعات کے ایک ہزار اڈیشن کے نکلنے میں برسوں لگ جاتے ہیں، پھر بھی ہم گلہ مند ہوئے بغیر اپنے علمی مقصد کی تکمیل میں لگے ہوئے ہیں، اور کسی حال میں بھی محض خریداروں کا حلقہ بڑھانے اور مالی منفعت حاصل کرنے کی خاطر اپنی پرانی روایت سے ہٹ کر اپنے معیار کو کم کرنا پسند نہیں کرینگے، اللہ تبارک تعالیٰ اس ادارہ کے ایثار پسند کارکنوں کے عزم بالجزم میں پوری استقامت عطا فرمائیں۔ آمین

⁂⁂⁂

مقالات

شیخ احمد سرہندیؒ

(مجدد الف ثانی)

از جناب پروفیسر محمد مسعود احمد صاحب حیدرآباد سندھ

(۲)

اس سے پہلے عرض کیا گیا تھا کہ شیخ مجددؒ (۱۰۳۴ھ / ۱۶۲۴ء) نے اپنے پیر بزرگوار خواجہ محمد باقی باللہؒ (م ۱۰۱۲ھ / ۱۶۰۳ء) کی وفات کے بعد اپنی تبلیغی مساعی کو تیز تر کردیا تھا۔ اکبر کے عہد (۹۶۳ھ / ۱۵۵۶ء تا ۱۰۱۴ھ / ۱۶۰۵ء) کا وہ حصہ ان تجدیدی مساعی کی شدت کا سبب بنا جو تاریخ اسلام میں ایک بدنما داغ کی حیثیت رکھتا ہے، اس میں شک نہیں کہ غیر مسلم مورخوں نے اکبر کو اتنا بڑھا چڑھا کر دیا ہے کہ اس کے سامنے شاہجہاں (م ۱۰۶۹ھ / ۱۶۵۸ء) اور اورنگ زیب (م ۱۱۱۹ھ / ۱۷۰۷ء) کے چراغ بھی ٹمٹماتے ہوئے نظر آتے ہیں، مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ غیر مسلموں نے ہمیشہ تاریخ اسلام کے ان لوگوں کے کردار کو خوب بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے جنھوں نے اسلام کا استیصال کیا، اور اس کے برعکس ان کی غیر حقیقی خامیوں کو خوب اچھالا جنھوں نے اسلام کی خدمت کی، بہرحال اب ہم حقائق کی روشنی میں یہ بتائیں گے کہ اکبر کا دور مجموعی حیثیت سے الحاد و بے دینی کا دور تھا،

جس کے رد عمل کے طور پر شیخ مجددؒ میدان عمل میں آئے۔

اکبر اور اس کا عہد نصیر الدین محمد ہمایوں ایک دیندار اور خدا ترس بادشاہ تھا، اسکی دینداری موت کے سانحہ سے معلوم ہوتی ہے، نظام الدین احمد، طبقات اکبری میں لکھتا ہے کہ ۸ ربیع الثانی ۹۶۳ھ/۱۵۵۶ء کو شام کے وقت بادشاہ لائبریری کی چھت سے نیچے اتر رہا تھا، اچانک اذان مغرب کی آواز آئی، سن کر فوراً بیٹھ گیا، جب اذان ختم ہوئی تو عصا پر ٹیک لگا کر اٹھا، زینہ سنگ مرمر کا تھا، سیڑھیاں پھسلواں تھیں، جونہی کہ وہ اٹھا عصا پھسل گیا، نیچے آرہا، شدید چوٹیں آئیں، جانبر نہ ہوسکا، بالآخر ۱۱ ربیع الثانی ۹۶۳ھ/۱۵۵۶ء کو اس کا انتقال ہوگیا،

جب ہمایوں کا انتقال ہوا تو اکبر، بیرم خاں (م ۹۶۷ھ/۱۵۵۹ء) کے ساتھ ضلع گورداس پور میں کلانور کے مقام پر سکندر سور کے تعاقب میں تھا، یہ اطلاع پہنچی تو بیرم خاں نے وہیں رسمی طور پر رسم تخت نشینی ادا کی، اور شاہ ہند ہونے کا اعلان کر دیا گیا، اس سے پہلے دہلی میں بھی اعلان کیا جا چکا تھا،

جب اکبر، آگرہ اور دہلی کی تسخیر سے فارغ ہوا تو آگرے میں دربار لگایا، مہمات ملکی سے فارغ ہونے کے بعد بیرم خاں نے اکبر کو تحصیل علم کی طرف متوجہ کرنا چاہا، مگر وہ اس طرف مائل نہ ہوا، اور شاہانہ مشغلوں میں منہمک رہا، اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ بار حکومت بیرم خاں کے کاندھوں پر تھا اور اکبر بالکل بے فکر تھا، اس سے پہلے بھی ملا عصام الدین ابراہیم، ملا بایزید، ملا عبد القادر، ملا پیر محمد وغیرہ نے پڑھانے کی کوشش کی تھی مگر وہ بھی ناکام رہے تھے، آگے چلکر شیخ مبارک ناگوری سے بھی مبادیات عربی کی تحصیل شروع کی تھی، مگر یہ بھی ادھوری ہی رہی، بہرکیف اکبر ان پڑھ ہی رہا،

جب بیرم خاں مکہ معظمہ جاتے ہوئے عظیم آباد پہنچا تو اس کے دشمنوں نے موقع پاکر اس کو شہید کر دیا (۹۶۷ھ/۱۵۵۹ء) — اب اکبر نے امور سلطنت میں دلچسپی لینی شروع کی،

ہم اکبر کے دور کو تین ادوار پر تقسیم کرکے ہر ایک کا علیحدہ علیحدہ جائزہ لیں گے،

پہلا دور ۹۶۳ھ/۱۵۵۶ء تا ۹۸۳ھ/۱۵۷۵ء اپنی زندگی کے پہلے دور میں اکبر ایک دیندار سنی مسلمان نظر آتا ہے، محمد حسین آزاد، دربار اکبری میں اس دور کے متعلق مندرجہ ذیل خیالات کا اظہار فرماتے ہیں، جن کی تصدیق مستند کتب تاریخ سے بھی ہوتی ہے:

"اٹھارہ بیس برس تک اس کا یہ حال تھا کہ جس طرح سیدھے سادے مسلمان خوش اعتقاد ہوتے ہیں اسی طرح احکام شرع کو ادب کے کانوں سے سنتا تھا اور صدق دل سے بجا لاتا تھا، جماعت سے نماز پڑھتا تھا، آپ اذان کہتا تھا، مسجد میں اپنے ہاتھ سے جھاڑو دیتا تھا، علماء و فضلاء کی نہایت تعظیم کرتا تھا، ان کے گھر جاتا تھا، بعض کے سامنے کبھی کبھی جوتیاں سیدھی کرکے رکھ دیتا تھا، مقدمات سلطنت شریعت کے فتویٰ سے فیصلہ ہوتے تھے، جابجا قاضی و مفتی مقرر تھے، فقراء و مشائخ کے ساتھ کمال اعتقاد سے پیش آتا تھا، اور ان کے برکت انفاس سے اپنے کاروبار میں فیض حاصل کرتا تھا.......

شیخ سلیم چشتی کے سبب سے اکثر فتحپور رہتا تھا، محلوں کے پہلو میں سب سے الگ پرانا سا حجرہ تھا، پاس پتھر کی ایک سل پڑی تھی، تاروں کی چھاؤں اکیلا وہاں جا بیٹھتا، نور کے تڑکے، صبحوں کے سویرے، رحمت کے وقت مراقبوں میں خرچ ہوتے تھے، عاجزی اور نیاز مندی کے ساتھ وظیفے پڑھتا، اپنے خدا سے دعائیں مانگتا، اور نور سحر کے فیض دل پر لیتا، عام صحبت میں بھی اکثر خدا شناسی، معرفت، شریعت اور طریقت ہی کی باتیں ہوتی تھیں، رات کو علما و فضلاء کے مجمع ہوتے تھے، اس میں بھی یہی باتیں اور حدیث، تفسیر اس میں علمی مسائل کی تحقیقیں، اسی میں مباحثے بھی ہو جاتے تھے"

(محمد حسین آزاد: دربار اکبری، مطبوعہ لاہور ۱۹۴۷ء ص ۴۴-۴۶)

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود اپنے فطری صلح کل کے رجحان کے تحت اس نے ہندو عورتوں سے شادیاں بھی کی تھیں، اس میں سیاسی مصالح کو بھی پورا پورا دخل ہے ۹۷۰ھ/۱۵۶۲ء کے اوائل میں، اکبر اجمیر شریف گیا، خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ (م ۶۳۳ھ/۱۲۳۴ء) کے آستانے پر حاضری دی، واپسی میں جب اکبر جے پور پہنچا تو راجہ بہاری مل نے اپنی وفاداری جتانے کے لیے لڑکی پیش کی جو قبول کرلی گئی، غیر شرعی نکاح کے بعد حرم میں داخل کرلی گئی، سیاسی مصلحتوں کے تحت ۹۷۲ھ/۱۵۶۴ء میں اکبر نے جزیہ بھی معاف کردیا تھا، جو بعد میں ۱۰۹۰ھ/۱۶۷۹ء میں اورنگ زیب نے جاری کیا،

بہرکیف اس دور میں اکبر الحاد و بے دینی کی طرف طبعاً مائل نہ تھا، غیر شرعی امور کا ظہور محض سیاسی مصلحتوں کے تحت ہوا، جو یقیناً قابل گرفت ہے۔

اکبر کے ہاں نرینہ اولاد نہیں ہوتی تھی، چنانچہ اس نے فتح پور سیکری میں شیخ سلیم چشتی (م ۹۷۹ھ/۱۵۷۱ء) سے دعا کی درخواست کی، ۱۷ ربیع الاول ۹۷۷ھ/۱۵۶۹ء میں دختر راجہ بہاری مل کچھواہہ کے بطن سے ابوالمظفر نورالدین جہانگیر تولد ہوا، جس کا نام شیخ موصوف کے نام پر تیمناً "سلیم" رکھا گیا، اس موقع پر اکبر کی صوفیاء سے عقیدت کا اس بات سے اظہار ہوتا ہے کہ وہ منت پوری کرنے آگرہ سے پاپیادہ اجمیر شریف گیا، عبدالباقی نہاوندی نے اس واقعہ کا یوں ذکر کیا ہے:-

"شہزادہ فرخندہ مولود کی ولادت سے پہلے حضرت نے یہ منت مانی تھی کہ اگر خدا نے کوئی فرزند عطا فرمایا تو حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے مزار مبارک کی زیارت کرنے پیدل جاؤں گا، چنانچہ اس منت کو پورا کرنے یوم جمعہ ۱۲ شعبان ۹۷۷ھ کو آگرہ سے پاپیادہ اجمیر تشریف لے گئے۔"

(عبدالباقی نہاوندی: مآثر رحیمی، جلد اول، مطبوعہ کلکتہ ۱۹۲۴ء، ص ۷۶۸)

ملا عبدالقادر بدایونی (م ۱۰۰۴ھ/۱۵۹۵ء) دربار اکبری کے ممتاز علماء میں تھے، موصوف کی منتخب التواریخ اس مضمون کا اصل ماخذ ہے، مگر اس سے پہلے کہ تاریخ مذکور کی روشنی میں اکبر کی زندگی کا جائزہ لیں، بہتر معلوم ہوتا ہے کہ ان کی سوانح زندگی پر آزاد کا مختصر اقتباس بھی مطالعہ کرتے چلیں، کیونکہ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ مورخ موصوف متعصب و متشدد تھے۔

مولانا غلام علی آزاد بلگرامی تحریر فرماتے ہیں:-

"جامع فنون و فضائل" اور "نادر قران و امائل" تھے، شیخ مبارک ناگوری اور دیگر فضلائے عصر سے کسب کمالات کیا تھا، علمی فضیلت کے ساتھ عربی نظم و نثر بھی خوب لکھتے تھے، ہندی اور حساب بھی جانتے تھے، دیسی اور بدیسی نغموں سے بھی شوق تھا، خوش مذاق تھے، شطرنج وغیرہ کھیلا کرتے تھے، نے نوازی کا بھی شوق تھا، قناعت پسند اور راست گفتار تھے۔

جلال خاں قورچی اور میر فتح اللہ شیرازی کی سفارش سے دربار اکبری میں منصب "پیش امامی" پر فائز ہوئے، چالیس سال تک فیضی اور ابوالفضل کے مصاحب رہے، موصوف کی راست گفتاری کی اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہوگی کہ اکبر بادشاہ کے چالیس سالہ واقعات کی بال کی کھال نکال کر پیش کی ہے، اور کلمۂ حق کے اظہار میں "اسلام کے صاحب داعیہ" بادشاہ کی مخالفت کا بھی خیال نہ کیا اور آیۂ "الیس اللہ بکاف عبدہ" پر عمل کیا، (غلام علی آزاد بلگرامی: مآثر الکرام، مطبوعہ آگرہ ۱۳۲۸ھ/۱۹۱۰ء ص ۴۰)

مندرجۂ بالا بیان سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ملا عبدالقادر بدایونی متبحر عالم تھے، ایسے راست گو اور راست مزاج مورخ جو دوست و دشمن کی بھی رعایت نہ کرے اور اپنی خامیوں بیان کرنے میں بھی ذرا نہ جھجکے، ظاہر ہے کہ ایسے مورخ کی تالیف ہر حیثیت سے مستند ہے،

خصوصاً ان حالات کی صحت میں تو کوئی شک ہی نہیں جو انھوں نے بچشم خود دیکھے۔

اکبر کے دینی رجحان کے بارے میں ملا عبد القادر کا بیان ملاحظہ ہو، دور اول ہی کے بارے میں اکبر کے متعلق تحریر کرتے ہیں:-

"پانچوں وقت دربار میں نماز باجماعت کے لیے کراتے تھے" (منتخب التواریخ، ج۲ ص ۳۱۵)

علماء کی قدر و منزلت کے متعلق لکھتے ہیں:-

"بادشاہ بہ تقاضائے کمال تعظیم و تکریم گاہے گاہے احادیث نبویہ سننے کے لیے شیخ (عبد النبی) کے مکان پر تشریف لے جاتے تھے، اور ایک روز تو بادشاہ نے شیخ موصوف کی جوتیاں بھی سیدھی کی تھیں۔" (منتخب التواریخ ج۲ ص ۳۱۵)

مگر یہ عزت و احترام دوسرے دور میں باقی نہیں رہا، یہی ملا عبد النبی جلاوطنی کے دن گزار کر جب مکہ معظمہ سے واپس آئے تو ایک روز سر دربار:-

"بادشاہ (اکبر) نے بنفس نفیس شیخ (عبد النبی) کے منہ پر زور سے ایک طمانچہ رسید کیا، اس پر شیخ نے کہا کہ مجھکو چھری سے کیوں حلال نہیں کر دیتے۔" (ایضاً ج۲ ص ۳۱۱)

اس سے قبل کہ ہم عہد اکبری کے دوسرے دور کا جائزہ لیں، مناسب ہوگا کہ پہلے ان تین کرداروں کے متعلق کچھ عرض کر دیا جائے جنھوں نے اس دور میں اکبر کے ذہنی انقلاب میں نمایاں کام کیا ہے، یعنی شیخ مبارک ناگوری، ان کے دونوں صاحبزادے شیخ ابو الفیض فیضی اور ابو الفضل۔

شیخ مبارک ناگوری (م ۱۰۰۱ھ / ۱۵۹۲ء) بن شیخ خضر ناگوری متبحر عالموں میں تھے، بقول مولانا غلام علی آزاد بلگرامی موصوف نے پانچ سو ضخیم مجلدات اپنے ہاتھ سے تحریر کیں، آخر عمر میں گو کہ قوت باصرہ جواب دے چکی تھی، مگر محض حافظہ کی بنا پر تفسیر عیون المعانی

کی چار جلدیں محرروں سے لکھوائیں۔ (غلام علی آزاد بلگرامی: مآثر الکرام مطبوعہ آگرہ ۱۳۲۸ھ / ۱۹۱۰ء ص ۱۹۰)

لیکن اس تبحر علمی کے باوجود الحاد و بے دینی کے فروغ میں جو کارہائے نمایاں کیے وہ ابھی آپ کے سامنے آئے جاتے ہیں۔

شیخ ابو الفیض فیضی (م ۱۰۰۴ھ / ۱۵۹۵ء) بقول غلام علی آزاد بلگرامی "برہان فضیلت" تھے، جب ان کی علمی لیاقتوں کی خبر اکبر تک پہنچی تو اس نے ۹۷۳ھ میں دربار میں طلبی کا حکم صادر کیا، خدمت میں حاضر ہو کر مورد عنایات شاہی ہوئے، "ملک الشعرا" کا خطاب پایا، موصوف نے صرف دو برس میں تفسیر بے نقط، سواطع الالہام (۱۰۰۲ھ / ۱۵۹۳ء) تالیف کی، فضلائے عصر نے توقیعات لکھیں، علمی دنیا میں یہ تالیف فیضی کا زبردست شاہکار ہے، اکبر کو بڑی محبت تھی، جب مرض الموت میں مبتلا ہوئے تو آدھی رات کو خود عیادت کے لیے آیا اور سر کو اٹھا کر اپنے زانو پر رکھا۔ (غلام علی آزاد بلگرامی: مآثر الکرام، مطبوعہ آگرہ ۱۳۲۸ھ / ۱۹۱۰ء ص ۱۹۹)

فیضی ہی کی وساطت سے ۹۸۱ھ / ۱۵۷۳ء میں ابو الفضل اکبر کے دربار میں باریاب ہوا، پھر دوسری مرتبہ ۹۸۲ھ / ۱۵۷۴ء میں باریابی ہوئی اور اکبر کا منظور نظر ہو گیا۔ صاحب تذکرہ "ہفت اقلیم"، امین احمد رازی موصوف کے متعلق لکھتا ہے:-

"آج عقل و فہم میں کوئی اس کا ثانی نہیں، باوجود اس کے وہ شاہی خدمت میں ہر وقت اس طرح حاضر رہتا ہے جیسے جوہر کے ساتھ عرض، مگر پھر بھی جب کبھی وقت ملتا ہے تحصیل و تحقیق علم میں لگا رہتا ہے اور فن تحریر میں تو ید بیضا رکھتا ہے۔"

(بحوالہ محمد حسین آزاد: دربار اکبری، مطبوعہ لاہور، ۱۹۴۷ء ص ۷۰۹)

لیکن بقول ملا عبد القادر بدایونی، مذکورۂ بالا تینوں حضرات نے باوجود علم و فضل

کے علمائے اسلام کی بیخ کنی، اسر در بار ذلیل کرایا، جس کی وجہ سے خود اسلام کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا، یہ سب کچھ انتقامی جذبے کے تحت تھا جس کی تفصیل یہ ہے:۔

شیخ عبد النبی اور مخدوم الملک نے شیخ مبارک ناگوری کو معتوب شاہی کرایا تھا، چونکہ اکبر شیخ سلیم چشتی سے عقیدت رکھتا تھا اس لیے موعوب راندۂ درگاہ ہو کر سفارش کے لیے شیخ ممدوح کے پاس گئے، انھوں نے گجرات چلے جانے کی ہدایت کی، آخر کار مرزا عزیز کوکہ کے توسل سے شیخ مبارک ناگوری کا کھویا ہوا وقار مل گیا، اب انھوں نے علماء سے انتقام لینے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا، دونوں بیٹے بھی ان کے ساتھ تھے، اس انتقام کا جو الم ناک نتیجہ نکلا اس کو دیکھ کر ابوالفضل خود منفعل ہے، ملا عبدالقادر بدایونی لکھتے ہیں کہ ابوالفضل کی زبان پر بار بار یہ رباعی آتی تھی:۔

آتش بہ دو دست خویش در خرمن خویش — چوں خود زدہ ام چہ نالم از دشمن خویش

کس دشمن من نیست منم دشمن خویش — اے وائے من و دست من و دامن خویش

(ترجمہ) میں نے تو اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنے خرمن میں آگ لگائی ہے، جب خود ہی آگ لگائی ہے تو دشمن کا کیا رونا روؤں۔ میں خود اپنا دشمن ہوں، میرا کوئی دشمن نہیں، حیف میں نے اپنے ہاتھوں سے خود اپنا گریباں چاک کر لیا، (منتخب التواریخ، ج ۲)

انھی کے انتقامی جذبے نے اکبر کو لادینیت کی طرف مائل کر دیا اور بالآخر ۹۹۰ھ/۱۵۸۲ء میں "دین الٰہی" کا اعلان کر دیا گیا جس کی تفصیل آگے آئے گی، شیخ مبارک ناگوری اور ابوالفیض فیضی و ابوالفضل نے اس مذہب کو اس لیے قبول کر لیا تھا کہ یہ انھی کی مساعی کا تلخ ثمرہ تھا۔

پوویل پرائس (Powe l Price) خاندان شیخ مبارک کیلیے رقم طراز ہے:۔

"شیخ مبارک کا خاندان اس راہ کو وضع کرنے کا پورا ذمہ دار ہے جو دین الٰہی کی تکمیل کا سبب بنا، فیضی (شاعر)، ابوالفضل (معتمد و مورخ) اس دین کے خاص نمائندے تھے، ان کے ساتھ راجہ بیربل بھی شریک تھا"

(Pawell-Price: A History of India, New York 1958, P 267)

ابوالفضل کے متعلق تو خود جہانگیر کے یہ تاثرات تھے:۔

"جس نے اپنے ظاہر کو زیور اخلاص سے آراستہ کر کے بہت گراں قیمت پہ میرے باپ کے ہاتھ بیچا تھا" (تزک جہانگیری) (بحوالہ محمد معشوق حسین: حالات نور الدین جہانگیر، مطبوعہ آگرہ)

جہانگیر تو ابوالفضل سے اتنا متنفر تھا کہ بالآخر بیر سنگھ دیو کے ہاتھوں ۱۰۱۱ھ/۱۶۰۲ء میں اس کا سر قلم کروا کر الہ آباد منگایا۔

دوسرا دور ۹۸۳ھ/۱۵۷۵ء تا ۹۸۵ھ/۱۵۷۸ء

۹۸۳ھ/۱۵۷۵ء میں ایک عمارت تعمیر ہوئی جس کا نام عبداللہ نیازی سرہندی نے "عبادت خانہ" رکھا، یہ عبادت خانہ اسی جگہ تعمیر ہوا تھا جہاں اکبر اپنی زندگی کے پہلے دور میں:۔

"مراقبے فرماتے تھے اور فیض صبح گاہی حاصل کرتے تھے۔" (منتخب التواریخ ج ۲ ص ۳۱۵)

اسی عبادت خانے کی سرگرمیوں سے اکبر کے دوسرے دور کا آغاز ہوتا ہے،

چونکہ اکبر کو ہر وقت اصولی و فروعی مسائل دین کی تحقیق کا ایک چسکا لگا ہوا تھا، اس لئے اس عبادت خانے میں ہر جمعہ کو رات کے وقت ایک مجلس ہوا کرتی تھی جس میں ہر مکتب فکر کے علماء و مشائخ شریک ہوتے تھے، بادشاہ الطاف خسروانہ سے بھی نوازتا تھا۔

ان ہی خسروانہ نوازشوں نے علماء کے اندر بغض وعناد کا بیج بویا ــــ عبدالقادر بدایونی کے قول کے مطابق اس مجلس میں سو سے زیادہ علماء شریک ہوتے تھے۔

"مباحثین ومناظرین محقق ومقلد تقریباً سو سے متجاوز ہوں گے"۔ (منتخب التواریخ ج ۲ ص ۱۸۸)

علماء میں سب سے پہلے نشستوں پر باہمی چپقلش شروع ہوتی، اس قسم کی بچر باتوں سے اکبر کے دل میں علماء کا وقار کم ہونے لگا، اس کے بعد مسائل مختلف فیہ پر بجائے حکیمانہ اور عالمانہ تبادلۂ خیال کے اس طرح لڑنے جھگڑنے لگے گویا ایک دوسرے کو کھا جائیں گے، بقول ملا عبدالقادر بدایونی :-

"آپس میں تیغ زبان کھینچ کر مقابلے پر آجاتے اور ایک دوسرے کو کھلم کھلا کافر و گمراہ کہا کرتے تھے"۔ (منتخب التواریخ، ج ۲)

اور شاہانہ ادب واحترام کو ملحوظ خاطر نہ رکھتے ہوئے عامیانہ طریقے پر :-

"غصہ سے علمائے عصر کی رگیں پھول جایا کرتی تھیں اور پھر خوب ہی غل و شور ہوتا"۔

(منتخب التواریخ، ج ۲)

حاجی ابراہیم سرہندی (م ۹۹۴ھ) کے فتوے پر تو علماء اتنے برہم ہوئے کہ آپس میں عصا اٹھ گیا اس قسم کی مذہب و اخلاق سے گری ہوئی باتوں کو دیکھ کر اکبر علماء سے بدظن ہو گیا۔

علماء کے دو گروہ ہو گئے، حاجی ابراہیم سرہندی اور ابوالفضل ایک طرف اور مخدوم الملک اور مولانا عبداللہ سلطان پوری دوسری طرف، اور پھر خوب خوب مقابلے ہوئے، شیخ مبارک اور فیضی بھی شریک تھے، بہر کیف ایک طرف متشدد سنی علماء اور دوسری طرف آزاد منش علماء تھے۔ پوویل پرائس (Pawell-Price) لکھتا ہے :-

"اول اول یہ مباحثے اور مناظرے مسلم علماء تک محدود رہے، چنانچہ علماء اہل سنت کے صدر، مخدوم الملک اور شیخ عبدالنبی خاص مناظرین میں تھے، ان کے برخلاف شیخ مبارک

اور ان کے صاحبزادگان فیضی (شاعر) اور ابوالفضل ایسی رواداری کے حامی تھے جس میں آزادیٔ فکر کی پوری پوری اجازت ہو، اس طرح ان مباحثات کی تیزی اور تندی بڑھتی ہی گئی"۔ (Pawell-Price : A History of India, Londan 1958, P. 261)

اکبر سیاسی مصلحتوں کے پیش نظر "صلح کل" کا حامی تھا، اس میں اس کی ہندو بیویوں کے اثرات بھی شامل تھے، شیخ مبارک اور ابوالفضل و فیضی نے بھی یہی روش اختیار کر لی تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہ کی نظر میں وہ تو محبوب ہو گئے اور دوسرے علماء معتوب ٹھہرے، پوویل پرائس (Pawell-Price) لکھتا ہے :-

"سنی علماء کے تشدد اور باہم سب و شتم نے اکبر کو ان سے بیزار کر دیا، چنانچہ اس نے مخدوم الملک اور شیخ عبدالنبی کو (جلاوطن کر کے) کہ مکرمہ بھیج دیا"۔

(J.C. Pawell-Price: A History of India, Landan 1958, P-262)

۹۸۳ھ / ۱۵۷۵ء میں گیلان سے حکیم ابوالفتح (م ۹۹۷ھ / ۱۵۸۸ء) اور ان کے دونوں بھائی حکیم ہمام (م ۱۰۰۳ھ / ۱۵۹۴ء) اور نورالدین قراری ہندوستان آئے، اول الذکر ندیم شاہی ہوئے، اکبر کے بگاڑنے میں یہ بھی ابوالفضل کے شریک کار ہو گئے، حتیٰ کہ اس کو وحی اور نبوت سے بھی منکر کر دیا۔

(مفتی ذکاءاللہ : اقبال نامہ اکبری، مطبوعہ دہلی، ۱۸۹۷ء)

بہر حال علماء سے بادشاہ کی بدگمانی زیادہ تر خود ان کی اپنی روش کی وجہ سے تھی، چوں کہ اکبر ان پڑھ تھا اس لیے اس نے ان ہی "مغضوب" علماء کے حال کو اسلاف کے حال پر محمول کر لیا اور ان سے بھی بدظن ہو گیا، ملا عبدالقادر بدایونی تحریر کرتے ہیں :-

"اکبر اپنے عہد کے علماء کو امام غزالی اور امام رازیؒ سے بھی بہتر جانتا تھا، جب اس نے ان کی رکاکتوں کو دیکھا تو پھر حاضر کو غائب پر قیاس کر کے اسلاف سے بھی بیزار ہو گیا"۔
(منتخب التواریخ، ج ۲)

ایک روز اکبر نے شیخ مبارک ناگوری سے کہا:-

"ہم کو ان ملاؤں کے احسان سے کیوں نجات نہیں دلواتے"؟

شیخ مبارک موقع کی تلاش میں تھے ہی، چنانچہ ۹۸۷ھ/۱۵۷۹ء میں انھوں نے ایک محضر نامہ تیار کیا اور اس پر علماء کے دستخط لیے، سب کو طوعاً وکرہاً دستخط کرنے پڑے، اس محضر نامے کی آخری عبارت یہ ہے:-

"...... جن مسائل دین میں مجتہدین میں اختلاف پایا جاتا ہے، اگر بادشاہ اپنے "ذہن ثاقب" اور "فکر صائب" سے اس اختلاف کو رفع کرتے اور معیشت بنی آدم کی سہولت اور انتظام عالم کی مصلحت کی بنا پر کوئی خاص راستہ اختیار فرمالیں اور حکم دیں تو وہ متفق علیہ سمجھا جائےگا، اس کی اتباع عوام پر لازم اور لابدی ہوگی، اگر اپنی رائے صائب کی بنا پر ایسا حکم صادر فرمائیں جو نص کے مخالف نہ ہو اور اس میں رفاہ عامہ ہو تو اس پر عمل کرنا ہر ایک کے لیے لازم اور ضروری ہوگا، اس کی مخالفت دینی اور دنیوی بربادی اور خسران واخروی مواخذہ کی مستوجب ہوگی"۔ (منتخب التواریخ، ج ۲ ص ۲۷۲)

یہ تھا وہ محضر نامہ جس نے آگے چل کر الحاد وبے دینی کا دروازہ کھولا، اس محضر نامہ کی رو سے بادشاہ کو "سلطان عادل" اور "امام عادل" قرار دیا گیا اور اس کے فیصلے کو حجت قاطع۔ اب علما کا تفوق ختم ہوگیا۔ "امام عادل" بننے کے بعد ہی کا یہ واقعہ ہے کہ ایک روز اکبر فتحپور سیکری کی جامع مسجد میں جمعہ کے روز حافظ محمد امین خطیب کو ہٹا کر خود خطبہ پڑھنے کھڑا ہوگیا، یہ خطبہ منظوم تھا اور فیضی نے لکھا تھا، چند ہی شعر پڑھے ہوں گے کہ اچانک بدن پر لرزہ طاری ہوگیا، فوراً نیچے اتر آیا اور خطیب موصوف کو کھڑا کیا۔

اکبر کی اس بے راہ روی کو دیکھ کر ۹۸۸ھ/۱۵۸۰ء میں جونپور کے قاضی القضاۃ ملا محمد یزدی نے

علی الاعلان فتویٰ دیا کہ بادشاہ بدمذہب ہوگیا ہے، اس پر جہاد واجب ہے، دربار میں قطب الدین خاں کوکہ اور شہباز خاں کنبوہ نے بڑی جرأت سے بادشاہ کو سمجھایا لیکن حکومت اور اقتدار کا نشہ برا ہوتا ہے، اکبر اور بگڑا، قطب الدین خاں، اور شہباز خاں کو برا بھلا کہا اور ملا یزدی اور معز الملک وغیرہ کو ایک بہانہ سے بلا بھیجا جب وہ آگرہ سے دس کوس فیروز آباد پہنچے تو حکم بھیجا کہ ان دونوں کو الگ کرکے دریائے جمن کے راستہ گوالیار پہنچا دو، جہاں مجرمان سلطنت کا جیل خانہ تھا، پھر حکم ہوا کہ ان کا خاتمہ کردو، چنانچہ پہرے داروں نے دونوں کو ایک ٹوٹی ہوئی کشتی میں ڈالا، تھوڑی دور آگے جاکر گرداب کی گود میں دفن کردیا، کچھ عرصہ بعد قاضی یعقوب بھی بلائے گئے اور انھیں اور دوسرے علماء کو جن پر شبہہ تھا ایک ایک کرکے عدم کے تہ خانے میں بھیجدیا۔"

(شیخ محمد اکرام: رود کوثر، مطبوعہ لاہور، ۱۹۵۸ء)

اسی سنہ میں یعنی ۹۸۸ھ/۱۵۸۰ء میں عبادت خانے کی محفلوں میں غیر مذاہب کے علماء بھی شریک ہونے لگے، چنانچہ پوول پرائس (Pawell-Price) لکھتا ہے:-

"اب اکبر نے نہ صرف مسلم علماء کو بلکہ جینی، ہندو، زردشتی اور بودھ علماء کو بھی ان مباحث میں شامل کرلیا، اور جلد ہی ایک عیسائی تبلیغی جماعت کو بھی بلا بھیجا۔"

(J.C. Pawell-Price: A History of India London 1958. P 262)

اکبر نے پرتگالی نوآبادی گوا سے عیسائی پادریوں کو بلایا تھا، اس جماعت میں یہ لوگ شریک تھے، انٹونیو مونسیرٹ (Antonio Manserrate) روڈلف اکوا ویوا (Rodolfho Acquaviva) اور فرانسکو اینری کوئس (Francisco Enriques) یہ جماعت ۹۸۶ھ/۱۵۷۸ء کے آخر میں گوا سے روانہ ہوئی اور ۹۸۸ھ/۱۵۸۰ء میں اکبر آباد پہنچی، دربار میں حاضر ہوئی، عبادت خانے کی محفلوں میں بھی شریک رہی، ان لوگوں نے

اسلام کے خلاف بہت کچھ زہر اگلا، مگر اکبر خاموشی سے تماشا دیکھتا رہا، بلکہ ان کی تقاریر سے متاثر بھی ہوا، یہ اسی تاثر کا نتیجہ تھا کہ شہزادہ سلیم اور شہزادہ مراد کو حکم دیا کہ ان لوگوں سے تیمناً انجیل کے چند اسباق پڑھ لیں، چنانچہ ابوالفضل نے ترجمانی کے فرائض انجام دیے،

معلوم ہوتا ہے کہ عام لوگ اکبر کے اس فعل سے بد دل تھے، اور پادریوں کی اس جماعت کو بھی کسی قیمت برداشت نہیں کر سکتے تھے، یہی وجہ ہے کہ ۹۹۰ھ / ۱۵۸۲ء میں روڈلف اکوا ویوا کو اکبر آباد ہی میں قتل کر دیا گیا،

۹۹۰ھ / ۱۵۸۲ء میں عیسائی تاجروں کی ایک جماعت ملکہ الزبتھ (۹۶۶ھ / ۱۵۵۸ء تا ۱۰۱۲ھ / ۱۶۰۳ء) کا پیغام لیکر ۹۹۳ھ / ۱۵۸۵ء میں اکبر آباد پہنچی تھی، اس میں یہ تین افراد شامل تھے، رلیف فِٹچ (Ralph Fitch)، جان نیوبری (John Newbery) اور ولیم لیڈس (William Leeds)

(G. T. Garrat: The Legacy of India, Oxford 1951, P. 27-8.)

بقول ملا عبد القادر بدایونی، اکبر کے دربار میں ہندو اور بدھ مشی اکثر باریاب ہوتے تھے، شاہی ملاقاتوں میں ان کی یہی کوشش ہوتی تھی کہ اسلام کو دین باطل ثابت کر کے اپنے مذہب کی حقانیت کو ظاہر کریں، چنانچہ یہ لوگ مذہب اسلام پر بے باکانہ حملے کرتے تھے، اور اکبر اطمینان وسکون سے سنتا رہتا،

ان ہی لوگوں کے اثرات کی وجہ سے اکبر نے ہندوؤں کی مذہبی کتابوں اتھروید، راماین اور مہابھارت وغیرہ کے ترجمے کا حکم دیا تھا، تاکہ بخوبی واقفیت پیدا کر سکے، اسی طرح انجیل کے ترجمے کے لیے ابوالفضل کو حکم ملا تھا،

ہندو درشیوں کے اس اختلاط کا یہ نتیجہ بھی نکلا کہ بادشاہ کو عربی زبان سے نفرت سی ہو گئی چنانچہ اس نے پرتم نامی ایک برہمن سے چیزوں کے عربی نام کے بجائے سنسکرت نام تجویز کرنے کی فرمائش کی، عربی حروف تہجی کو تلفظاً ساقط کر دیا گیا،

دیبی نامی ایک اور برہمن جس نے مہابھارت کی شرح بھی لکھی تھی، اکثر باریاب ہوتا تھا، اس نے اکبر کو بتوں کی پوجا پاٹ کے طریقے سکھائے، آگ، سورج اور ستاروں کی پوجا کے بھی طریقے بتائے اور اپنے دیوتاؤں کی پرستش کے آداب بھی سکھائے،

خود مسلم فلاسفہ اور متصوفہ نے نظریہ توحید وجودی کو جس غلط رنگ میں پیش کیا تھا اس نے اکبر کو اور الحاد کی طرف مائل کر دیا، بقول عبد القادر بدایونی، شیخ تاج الدین دہلوی، صاحب نزہتہ الارواح، جو فلسفۂ وجودی میں شیخ محی الدین ابن العربی (م ۶۳۸ھ / ۱۲۴۰ء) کے ثانی سمجھے جاتے تھے اکثر دربار میں باریاب ہوتے تھے، رات رات بھر رہتے اور وجودی فلسفہ کو بیان کرتے، خود ابوالفضل بھی اسی نظریہ کا پیرو تھا، بقول صاحب تذکرۂ ہفت اقلیم، اکبر کی خدمت میں صبح و شام اس طرح رہتا تھا جیسے ذات کے ساتھ صفات، ظاہر ہے کہ اس کے نظریات نے اکبر پر بڑا اثر کیا ہوگا موصوف کے ان خیالات سے وجودی فلسفہ کی پیروی کا اظہار ہوتا ہے:-

اے خدا! ہر معبد میں، میں تیرے طالبوں کو دیکھتا ہوں، ہر زبان میں تیری ہی حمد کیجاتی ہے ہر مذہب یہی تعلیم دیتا ہے کہ تو وحدہٗ لاشریک ہے۔

مسجد و مندر ہو یا گرجا ہر جگہ تیری ہی عبادت کیجاتی ہے، کبھی میں تجھکو گرجا میں تلاش کرتا ہوں اور کبھی مسجد میں، ہاں، میں ایک معبد سے دوسرے معبد میں تجھکو تلاش کرتا پھرتا ہوں۔

اے خدائے برتر! تیرے یہاں دین و الحاد کا کوئی امتیاز نہیں کیونکہ تیری ردائے حق کے پیچھے ان دونوں میں سے کسی کی گنجایش نہیں۔

الحاد، ملحدوں کو مبارک ہو اور دین، دینداروں کو، ہاں، پھول کی پنکھڑیاں گل فروش کو مبارک ہوں!"

(J. C. Pawell-Price: A History of India, London, 1958, P. 268
S. Lane-Poole: Mediaval India)

مندرجہ بالا خیالات سے لادینی رجحان کا پتا چلتا ہے، اکبر کی پوری زندگی کو اسی تصور نے پوری طرح احاطہ میں لے لیا تھا، پھر اس پر ہندوؤں سے اختلاط اور ان کی کافرانہ تعلیمات سونے پر سہاگہ ثابت ہوئیں،

ملا عبد القادر بدایونی لکھتے ہیں کہ

"ولایت گجرات کے شہر نوساری سے آتش پرست آئے تھے، ان لوگوں نے بادشاہ کے سامنے زردشت کی حقانیت کو ثابت کیا، آگ کی پرستش سکھائی اور اپنی طرف مائل کر کے کیانیوں کی رسم و راہ سے واقف کیا۔" (منتخب التواریخ، ج ۲)

چنانچہ ان تعلیمات نے اپنا اثر دکھایا:۔

"عجمی بادشاہوں کی طرح محل شاہی میں دن رات آگ سلگتی رہتی تھی اور اس کی نگرانی ابو الفضل کیا کرتے تھے۔" (منتخب التواریخ، ج ۲)

بقول صاحب دبستان المذاہب، محسن فانی، اکبر کے دربار میں ایک سرپھرا اور منچلا فلسفی بھی آیا تھا، جس نے اپنے منطقیانہ اور فلسفیانہ دلائل و براہین سے یہ ثابت کیا تھا کہ نبی کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ بنی نوع انسان سے بغیر حیل و حجت اطاعت و فرمانبرداری کا طالب ہو، اسی تصور کے تحت اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بھی یاوہ گوئی اور دریدہ دہنی سے کام لیا، مذہب اسلام کے متعلق تو یہاں تک کہدیا کہ یہ نہ عقلاء کے لیے مفید ہے اور نہ حمقاء کے لیے (معاذ اللہ) یہ ساری گفتگو اکبر ٹھنڈے دل سے سنتا رہتا تھا۔

بہرکیف بقول ملا عبد القادر بدایونی:۔

"قسم قسم کے ارباب عقل اور مختلف ادیان و مذاہب کے علماء دربار میں جمع ہوتے اور بادشاہ سے ہم کلامی کا شرف حاصل کرتے تھے۔ دن رات تحقیق و تفتیش کے علاوہ

بادشاہ کو کسی چیز سے دلچسپی نہ تھی۔" (منتخب التواریخ، ج ۲)

اس "تحقیق و تفتیش" کا مجموعی اثر یہ ہوا کہ بادشاہ کلی طور پر اسلام سے بیگانہ ہو گیا اور کافرانہ معتقدات میں دل سے شریک ہو گیا، چنانچہ بقول ملا عبد القادر بدایونی:۔

"دوسرے مذاہب والے جو احکام بیان کرتے تھے، اسلام کی ضد میں بادشاہ انکو نص قطعی سمجھتے تھے، اس کے برعکس ملت اسلامیہ اور دین اسلام کو نامعقول اور حادث خیال کرتے تھے، اور عرب بدوؤں کا گھڑا ہوا۔" (منتخب التواریخ، ج ۲)

اور پھر یہ اعتقاد و نظریاتی نہ تھا بلکہ عملی ہو گیا تھا جس نے اور تباہی مچائی، ملا عبد القادر بدایونی لکھتے ہیں:۔

"مسلمانوں کے علاوہ جس کی بھی جو بات پسند آتی تھی اس کو انتخاب کر لیا کرتے تھے لیکن جو چیز طبیعت و خواہش کے خلاف ہوتی تھی اس سے پرہیز لازم سمجھتے تھے۔" (ایضاً ج ۲)

شدہ شدہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ:

"پانچ چھ سال کے اندر اندر اسلام کا نام و نشان باقی نہ رہا اور معاملہ برعکس ہو گیا۔" (ایضاً ج ۲)

۹۸۸ھ / ۱۵۸۰ء میں اکبر نے مدد معاش کے لیے علماء و صوفیا کو بلایا تو بہت سے نفس پرست لوگ بھی پہنچے، ان ہی میں ایک عالم مولانا شیرازی تھے، ان صاحب نے اکبر کو یہ یقین دلایا کہ دنیا کی عمر سات ہزار سال ہو چکی ہے، چنانچہ اب مہدی موعود کا وقت آپہنچا ہے، اور اس سے اشارہ خود بادشاہ ہی کی طرف تھا، غرض بادشاہ کو طرح طرح سے بہکایا گیا اور وہ اپنی جہالت کی وجہ سے بہک بھی گیا،

ان تمام باتوں کے نتائج تیسرے دور میں نکلے جو نہایت بھیانک اور گھناؤنے ہیں،

(باقی)

سیرتِ نبویّہ

مُصنّفہ

ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب (پیرس)

از

ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ صاحب

"معارف" کے صفحات میں ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب کی سیرتِ نبویہ کا مختصر تذکرہ چند بار آچکا ہے، جو فاضل موصوف نے حال ہی میں فرانسیسی زبان میں تالیف فرمائی ہے، میری طرح ان کے بہت سے دوسرے نیاز مند بھی اس اہم تصنیف کے بارے میں مزید تفصیلات حاصل کرنے کے خواہشمند تھے، مصنف علام نے جو چند جملے اس کے متعلق اپنے مکتوبِ گرامی مندرجہ معارف بابت دسمبر ۱۹۶۰ء میں لکھے ہیں، وہ بھی کافی و شافی ثابت نہ ہوئے بلکہ ناظرین کے سمندِ شوق پر ان سے اور تازیانہ لگا، آخر کار میں نے وفورِ شوق سے مجبور ہو کر ایک طرف تو کیمبرج کے مشہور تاجر کتب ڈبلیو ہیفر اینڈ سنز کو کتاب کی بہم رسانی اور ترسیل کے لیے فرمائش بھیج دی، اور دوسری طرف ڈاکٹر صاحب کو ان کے پیرس کے پتہ پر لکھ بھیجا کہ آپ کی "سیرت نبویہ" کا معارف میں مختصر ذکر آیا ہے، براہ کرم اطلاع دیجئے کہ کتاب کا پورا عنوان کیا ہے، اور اس کا ناشر کون ہے، تاکہ اس کے حصول میں آسانی رہے، اس استفسار کے جواب میں ڈاکٹر صاحب موصوف نے کتاب ہی بھیج دی، جو راقم الحروف کو چند دن ہوئے بذریعہ ڈاک موصول ہو گئی ہے۔

اب میں اپنا خوشگوار فرض سمجھتا ہوں کہ کتاب کی وصولی سے جو خوشی مجھے حاصل ہوئی ہے اس میں ناظرین معارف کو بھی شریک کروں اور چند سطریں کتاب کے بارے میں بطور تعارف لکھوں جن سے دلدادگان سیرت کی تسکین کا قدرے سامان ہو جائے۔

ڈاکٹر صاحب موصوف تقریباً تیس سال سے سیرت نبوی کے متعلق نئے نئے عنوان قائم کر کے جدید معلومات فراہم کر رہے ہیں، اور اس موضوع کے نئے نئے گوشے روشن کر رہے ہیں، بالفاظ دیگر ایک مدت دراز سے ریاضِ رسالت میں نئے نئے پھول کھلا رہے ہیں اور مشتاقانِ رسول کے دیدہ و دل کو منور و معطر کر رہے ہیں، اپنے مرغوب موضوع کی طرف وہ جس دلآویز انداز میں بار بار رجوع کرتے آئے ہیں، اسے دیکھکر عرب شاعر کی یہ بیت بے اختیار زبان پر جاری ہو جاتی ہے،

اَعِدْ ذِکرَ نُعمانَ لنا اِنّ ذِکرَہٗ

هُوَالمِسکُ ما کرّرتَہٗ یَتضوّعُ

ان ہی منتشر پھولوں کو جمع کر کے اب فاضل مذکور نے نہایت سلیقہ کے ساتھ ایک خوبصورت گلدستہ تیار کیا ہے اور اسے اہل فرانس کی خدمت میں پیش کیا ہے، جن کے ہاں وہ ایک مدت سے مقیم ہیں، انھوں نے اپنے میزبانوں کے پاسِ خاطر سے اسے فرانسیسی کا جامہ پہنایا ہے

اگرچہ ڈاکٹر صاحب نے اس تالیف کے لیے فرانسیسی زبان اختیار کی ہے مگر بفضل خدا مشرق میں بھی ان کے بعض ایسے قدر دان بلکہ رمز شناس موجود ہیں جو ان کی ہر نوائے شیریں کو فردوسِ گوش بنانے کے لیے بیتاب ہیں:۔

سخن کز بہر دیں گوئی چہ عبرانی چہ سریانی

مکاں کز بہر حق جوئی چہ جابلقا چہ جابلسا

ڈاکٹر صاحب کی تالیف کردہ "سیرت نبویہ" دو جلدوں میں منقسم ہے، جن کی مجموعی ضخامت

۴۴، صفحات ہیں، صفحات کا شمار مسلسل ہے، اس تسلسل کا ایک فائدہ یہ ہے کہ انڈکس میں صفحات کا اشارہ کافی ثابت ہوا، جلد کا ذکر غیر ضروری ٹھہرا، کتاب سفید کاغذ پر خوبصورت ٹائپ میں چھپی ہے، سنہ اشاعت ۱۳۷۸ھ مطابق ۱۹۵۹ء اور مقام طباعت و اشاعت پیرس ہے، ناشر کا پتہ اور پورا نام حاشیہ میں دیکھئے۔

پہلی جلد میں جو ۴۴۰ صفحات میں ختم ہوئی ہے، رسول اکرمؐ کی زندگی کے واقعات کا بیان ہے۔ مضامین کی فہرست حسب ذیل ہے:-

پیش لفظ، تدوین سیرت کی ضرورت مذہبی اور علمی نقطۂ نظر سے، سیرت نبویہ کے مصادر و مآخذ، بعثت نبوی کے وقت مختلف اقطاع عالم کی حالت، قریش مکہ، ظہور قدسی، طفولیت اور ایام جوانی، حرب فجار، ازدواج، مذہبی شعور کی بیداری، بعثت، آغاز تبلیغ، ہجرت حبشہ، قریش کا بنو ہاشم سے مقاطعہ، معراج النبی، مدینہ میں اشاعت اسلام، اشاعت اسلام میں عورتوں کا حصہ، میثاق مدینہ اور اس کا ترجمہ، قریش مکہ کے ساتھ تعلقات، سلسلۂ غزوات (بدر، احد، احزاب وغیرہ) صلح حدیبیہ، فتح مکہ، حجۃ الوداع، خطبۂ حج، تبلیغی مراسلات بنام شاہان زمانہ، قبائل عرب کے ساتھ تعلقات، یہود اور نصاریٰ کے ساتھ تعلقات، دیگر اہل مذاہب کے ساتھ تعلقات، صوبہ جات اور ان کی سرحدیں۔

دوسری جلد صفحہ ۴۴۱ سے شروع ہوکر صفحہ ۸۴۳ پر ختم ہوجاتی ہے، فہرست مضامین حسب ذیل ہے:-

رسول اکرمؐ کی خانگی زندگی، ازواج مطہرات، اصول الدین (القرآن، حدیث نبوی)، عقائد اسلامی، اخلاقی تعلیم، اصول معاشرت، نظام تعلیم، مکہ کی شہری مملکت، سلطنت کا اسلامی تصور، عدالت گستری،

ﻠﻪ Le Prophite del'Islam. Tome I: Sa vie. Tome II Son Oeuvre. Par Muhammad Hamidullah. Lebrairie Philosophique J. Vrin, 6 Placedela Sorbonne, Paris V 1378. A.H = 1959 A.V.

اقتصادی نظام (اسواق العرب، محاصل سلطنت، اخراجات کی مدات، حاکم کا صرفۂ خاص، زکوٰۃ و صدقہ، تجارتی منڈیاں اور اجناس کے نرخنامے)، فوجی نظام، سفارت، سیاست نبوی کے چند بنیادی اصول، عہد نبوی کی طرز معاشرت، اسلام اور جمالیات، فنون لطیفہ، رسول اکرم کی وفات اور تدفین، مسئلہ خلافت،

ان میں اکثر مضامین ایسے ہیں جن کو فاضل مصنف اس سے پیشتر سپرد قلم کرچکے ہیں مگر ان میں بعد نظر ثانی ترمیم ہوئی ہے، چنانچہ بعض طویل مقالات کو کتاب کی موجودہ ضخامت اور گنجائش کی مناسبت سے قدرے مختصر کردیا گیا ہے اور بعض کو پھیلا دیا ہے، بعض عنوانات نئے ہیں، مثلاً فوجی نظام، سلطنت کی مالیات، تقسیم مملکت صوبہ جات اور اضلاع میں اور ان کی سرحدیں وغیرہ۔

سیرت کے آخر میں ان تمام کتابوں کی فہرست ہے جن سے مصنف علام نے اپنی تالیف میں کام لیا ہے، اس فہرست میں جو سات صفحوں میں پھیلی ہوئی ہے، مروجہ سیرت و تاریخ کے علاوہ کتب حدیث کا وسیع ذخیرہ ہے، اور دیگر متفرق قسم کی کتابیں ہیں جن میں سیرت نبوی کے متعلق کارآمد معلومات ملتی ہیں، یہ طویل فہرست فاضل مصنف کی وسعتِ نظر پر شاہد عدل ہے۔

مصنف نے اپنی کتاب کی غرض و غایت کو اور اسے فرانسیسی زبان میں تحریر کرنے کے سبب کو خود ہی اپنے مختصر مگر جامع پیش لفظ میں واضح کردیا ہے، لہٰذا ان امور کو اپنے الفاظ میں بیان کرنے کی بجائے یہی بہتر سمجھتا ہوں کہ اس پیش لفظ کا ترجمہ ہدیۂ ناظرین کردیا جائے:-

"اگرچہ فرانسیسی زبان کا دامن ادبی خزانوں سے مالا مال ہے، مگر میری رائے میں اس میں ابھی تک سیرت نبوی پر کوئی ایسی کتاب نہیں لکھی گئی جس میں رسول اکرمؐ کی زندگی اور ان کی تعلیم کا جامع بیان ہو، اسلام کا شمار دنیا کے عظیم الشان مذاہب میں ہوتا ہے، اسی مذہب کے بانیؐ کی سیرت کتابِ ہذا کا موضوع ہے جو اہل تحقیق کے لیے کئی پہلوؤں سے جاذبِ توجہ ہے۔

دنیا کی مختلف زبانوں میں سیرت نبویہ پر ہزارہا مقالے اور کتابیں لکھی جا چکی ہیں، مگر تعجب ہے کہ وہ تنظیمی ادارے جو امت کی فلاح و بہبود کے لیے قائم ہوئے تھے، محققین کی نگاہ سے اوجھل رہے ہیں، اس بارے میں جو تشنگی پائی جاتی ہے اس کو دور کرنے کی تالیف ہذا میں پہلی بار کوشش کی گئی ہے۔

سیرت نگاروں نے آج تک واقعات کے بیان میں بالعموم ترتیب زمانی کا لحاظ رکھا ہے مگر رسولِ خدا چونکہ بہت سے اعداءِ دین کے ساتھ بیک وقت برسرپیکار رہے تھے، اس لیے ان جماعتوں کے ساتھ آپ کے تعلقات کی جو نوعیت تھی، محض تسلسل زمانی کی پابندی سے اس کی بخوبی وضاحت نہیں ہو سکتی، لہذا اس تالیف میں واقعات کو خاص موضوعات کے تحت الگ الگ ابواب میں جمع کیا گیا ہے، اس طریق کار سے کلام میں بعض اوقات قدرے تکرار ہو گئی ہے مگر اس سے بیان زیادہ مربوط اور زیادہ موثر بن گیا ہے،

اس کتاب کی تحریر کا ایک سبب اور بھی ہے، مؤلف سوربون (یعنی پیرس یونیورسٹی) کا پرانا طالب علم ہے، اور بارہ سال سے اہل فرانس کی مہمان نوازی سے محظوظ و مستفید ہو رہا ہے، اپنے میزبانوں کی مہربانی کے اعتراف کی مجھے اس سے بہتر اور احسن صورت نظر نہ آئی کہ میں اپنے قلم کے ذریعے جو اس دنیا میں میرا واحد مال و متاع ہے، اپنی تیس سالہ مسلسل تحقیقات کے نتائج کو ان کی خدمت میں پیش کروں، وہ تحقیقات جو سیرت کے اصلی مصادر و مآخذ کے علاوہ دوسرے بیشتر محققین کی علمی کاوشوں پر بھی مبنی ہیں۔"

مندرجۂ بالا پیش لفظ میں چند ایک ایسے امور کی طرف اشارہ ہے جن کا ایک خاص پس منظر ہے، یہ پس منظر "معارف" کے بعض ناظرین سے پوشیدہ نہ ہوگا، مگر اس موقع پر اگر میں چند گزارشات اس کے متعلق پیش کروں تو انھیں شاید بے محل تصور نہیں کیا جائے گا،

ڈاکٹر صاحب نے اپنے "قلم" کی طرف جو لطیف اور دردانگیز اشارہ کیا ہے وہ ان کے نیازمندوں

کے لیے بیحد رقت انگیز ہے:۔

"اپنے قلم" کا نام لیا تو نے ہم نشیں
اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے

۱۹۴۷ء کے انقلاب کے وقت ڈاکٹر صاحب حیدرآباد (دکن) سے باہر تھے، حالات نے اجازت نہ دی کہ وطن واپس جا سکیں، ان کا جو کچھ اثاثہ اور جو کچھ مادی اور معنوی مال و متاع تھا وہیں رہ گیا، اور وہ زبان حال سے یہ کہہ رہے تھے:۔

نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بیخبر سوتا
رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

مگر ہاں ایک چیز تھی جس کو زمانے کا ظالم اور غاصب ہاتھ ان سے کسی صورت میں نہ چھین سکا اور وہ ان کا قلم معجز رقم تھا، جس کو انھوں نے اپنے پیش لفظ میں اپنا واحد مال و متاع کہا ہے، یہی وہ رشک انگیز قلم ہے جس کی انتھک روانی نے علم و فضل کے وہ دریا بہائے ہیں جن پر کوثر و تسنیم کا دھوکا ہوتا ہے،

انقلاب سیاسی و ملکی کے بعد انھوں نے پیرس میں پناہ لی، پھر حکومت پاکستان کی دعوت پر دستور سازی کے سلسلے میں ایک مشیر خصوصی کی حیثیت سے سال ڈیڑھ سال کراچی میں بسر کیا، اور ایک مرتبہ ۱۹۵۰ء میں ایک علمی محفل کی شرکت کے لیے چند دن لاہور بھی تشریف لائے، اور مجھے اپنی میزبانی کا شرف بخشا، یہی وہ زمانہ ہے جب مجھے اس مرد درویش کو قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا، جس کا علمی انہماک فناء فی العلم کے درجے تک پہنچا ہوا ہے، اور جس کے علمی کارناموں نے علمائے سلف کی یاد تازہ کر دی ہے ؎

مباش منکرِ غالب کہ در زمانۂ تست

ڈاکٹر صاحب کی مسلمہ فضیلت اور ان کی بین الاقوامی شہرت کی بنا پر پاکستان کے سرکاری
اور علمی اداروں میں ہزار ڈیڑھ ہزار مشاہرہ کے کئی عہدے ان کے لیے چشم براہ تھے، لیکن
انھوں نے بغیر کسی پس و پیش کے بیش قرار مشاہروں سے منہ موڑا اور محض علم دوستی اور علم پروری
کے جذبہ سے متاثر ہوکر درویشی اور قناعت سے اپنا ناطہ جوڑا،

پاکستان کو خیرباد کہہ کر اگر انھوں نے پھر پیرس کا رخ کیا تو یہ کوئی تعجب کی بات نہ تھی،
وہ اپنے طالب علمی کے زمانے میں بھی وہاں کی یونیورسٹی میں اکتساب علم کرچکے تھے اور اپنے
تجربہ کی بنا پر جانتے تھے کہ تصنیف و تالیف کے سلسلہ میں جو علمی ذخیرے اور دوسرے وسائل
ان کو پیرس میں میسر آسکتے ہیں وہ کسی اور جگہ آسانی سے مہیا نہیں ہوسکتے، اندریں حالات اگر
انھوں نے پیرس کو اپنے لیے بطور دارالہجرت اختیار کیا تو یہ حسن انتخاب نہ صرف انکے حسن مذاق
کی دلیل ہے بلکہ ان کی علمی خدمات کے پیش نظر قابل صد داد بھی ہے۔

ڈاکٹر صاحب موصوف نے گذشتہ چند سالوں میں جو علمی خدمات انجام دی ہیں وہ اسلامی
نقطۂ نظر سے نہ صرف قابل ذکر ہیں بلکہ لائق صد تحسین ہیں، اولاً انھوں نے ایک فرانسیسی
ادیب کے ساتھ مل کر قرآن مجید کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ کیا ہے، ڈاکٹر صاحب نے عربی متن کو سامنے
رکھ کر اسے فرانسیسی میں منتقل کیا، اور ان کے شریک کار نے محاورۂ زبان اور سلاست بیان کے
لحاظ سے ترجمہ پر نظر ثانی کی اور ادبی نقطۂ نظر سے اس کی نوک پلک درست کی اور اس اہتمام
کے ساتھ آخر کار یہ ترجمہ فرنچ بک کلب (Club Francais du Livre)
کی طرف سے شائع ہوا، اس سے فرانسیسی زبان میں قرآن مجید کے چند ترجمے موجود تھے، مثلاً
Kasimirsky کا ترجمہ جو پہلی بار ۱۸۴۰ء میں شائع ہوا، اور پھر کئی مرتبہ چھپا،
ابھی حال ہی میں پروفیسر بلاشیر (Blachere) اپنا جدید فرانسیسی ترجمہ دو جلدوں

میں شائع کرچکے ہیں، (مطبوعہ پیرس ۱۹۴۹ء - ۱۹۵۱ء) مگر ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب غالباً
پہلے مسلمان فاضل ہیں جن کو کلام پاک کو فرانسیسی زبان میں ترجمہ کرنے کی سعادت حاصل ہوئی ہے،
اس ترجمہ کی خاص خوبی اور اہمیت یہ ہے کہ فاضل مترجم نے ترجمہ کی صحت کے ساتھ ساتھ خالص اسلامی
نقطہ نظر کو ملحوظ خاطر رکھا ہے اور یہ ایک ایسی بات ہے جس کی اغیار سے توقع رکھنا عبث ہے،

ڈاکٹر صاحب کا دوسرا تازہ کارنامہ علامہ بلاذری (متوفی ۲۷۹ھ) کی "انساب الاشراف"
کی پہلی جلد کا ایڈٹ کرنا ہے، بلاذری تیسری صدی ہجری کا ایک نامور مورخ ہے جس کی "فتوح البلدان"
ایک عرصہ سے علمی حلقوں میں مشہور و متداول چلی آرہی ہے، مگر اس کے مقابلہ میں انساب الاشراف
ایک مطول کتاب ہے، جس میں عربوں کی تاریخ ان کے نامور خانوادوں کے اعتبار سے لکھی گئی ہے
اور مختلف خاندانوں اور افراد کے تذکرہ کے ضمن میں ان کے عہد کی تاریخ بھی آگئی ہے، ایک مدت
ہوئی پروفیسر آلورت (Ahlwardt) نے اس کا ایک حصہ جرمنی سے شائع
کیا تھا، جس میں عبدالملک اموی کے عہد خلافت کا بیان ہے، پھر بیت المقدس کی عبرانی یونیورسٹی
(Hebrew University) کی طرف سے اس کے دو حصے اور شائع ہوئے جو بنو امیہ خصوصاً
حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت کے متعلق ہیں، چونکہ وہاں اس کی آیندہ اشاعت کا کام رک گیا ہے
اس لیے اب مصری فضلا کی ایک کمیٹی نے ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی قیادت میں اس اہم تاریخی کتاب کی
مکمل اشاعت کا بیڑا اٹھایا ہے، اس نئے بندوبست کے مطابق پہلی جلد کی تصحیح و ترتیب ڈاکٹر
حمید اللہ صاحب کے سپرد ہوئی جو قاہرہ کے مشہور ناشرین دار المعارف کی طرف سے ۱۹۵۹ء میں شائع
ہوچکی ہے اور اشاریوں اور فہرستوں کو شامل کرکے ۲۲، صفحات میں ختم ہوئی ہے، چونکہ انساب الاشراف
کی ابتدا، بنو ہاشم سے ہوتی ہے اور رسول اکرمؐ کے حالات کے ضمن میں عہد رسالت کی پوری
تاریخ آگئی ہے، اس لیے کتاب کی پہلی جلد سیرت نبوی کے ساتھ مخصوص ہوگئی ہے، بلاذری دیگر

مثلاً مورخین محمد بن اسحٰق، الواقدی اور محمد بن سعد سے متاخر بلکہ ایک حد تک ان کا خوشہ چیں ہے، مگر اس نے دیگر ثقہ لوگوں سے بھی روایت کی ہے، لہٰذا اس کی تالیف کا ابتدائی حصہ سیرت نبوی کے اہم مآخذ میں شمار ہونے کے لائق ہے، ڈاکٹر صاحب نے اپنی وسیع اور وافر معلومات کی بدولت اس حصہ کو بڑی خوبی سے ترتیب دیا ہے، اس لیے اس حصہ کی اشاعت کو بھی انکی ان خدمات میں شمار کرنا چاہیے، جن کا تعلق سیرت نبوی کے ساتھ ہے،

ڈاکٹر صاحب کا تیسرا تازہ کارنامہ فرانسیسی زبان میں سیرت نبویہ کی تالیف ہے، جس کے تعارف کی غرض سے یہ سطور سپرد قلم ہوئی ہیں، متفرق مضامین جو آپ نے اس دوران میں علمی رسالوں میں لکھے، ان پر مستزاد ہیں، اور پھر توفیق الٰہی اور تائید ایزدی کی شان کریمی دیکھیے کہ فاضل مصنف نے یہ تمام اسلامی اور علمی خدمات اس زندہ طلسم کے پہلو میں بیٹھ کر ادا کی ہیں جس کا نام فرانس ہی، اہل پیرس کی رنگینی ان کے بے نظیر شہر کو رات کے وقت بقعہ نور بنا دیتی ہے، اور لوگ اسے مدینۃ النور کہتے ہیں، جہاں کا ہر ذرہ زائرین کے دامن دل کو اپنی طرف کھینچتا ہے، مگر اس کے ساتھ ہی ہمیں اس امر کو فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ اس شہر سے آفتاب علم کی کرنیں بھی پھوٹ پھوٹ کر نکلتی ہیں جو دور دور تک اقطاع عالم کو روشن کرتی ہیں، وہاں کی عشرت گاہوں اور نگارخانوں کے افسانے تو زبان زد خاص و عام ہیں، مگر عدل و انصاف کا تقاضا ہے کہ کبھی کبھی وہاں کے علمی اداروں اور ثقافتی مرکزوں کا بھی تذکرہ ہو جائے جو دنیا میں فقید المثال ہیں، سب سے پہلے وہاں کا قومی کتب خانہ (Bibliotheque Nationale) قابل ذکر ہے جس پر اہل فرانس کو بجا طور پر ناز ہے اور جس میں علاوہ دیگر علمی ذخیروں کے مشرقی زبانوں کی لاکھوں مطبوعہ کتابیں اور ہزاروں نادر قلمی نسخے محفوظ ہیں، وہاں سوربون (Sorbonne) کی یونیورسٹی ہے جہاں ہر علم و فن کے مستند اور قابل ترین اساتذہ سینکڑوں کی تعداد میں لیکچر دیتے ہیں، اور علم کے دریا بہاتے ہیں

پھر اسی یونیورسٹی کا ایک مخصوص معہد یا ادارہ ہے جسے Institut des Etudes Islamiques کہتے ہیں اور جہاں خاص اسلامیات یعنی اسلامی علوم کے متعلق تحقیقی کام ہوتا ہے، پروفیسر لاشیر آجکل اس کے مدیر اعلیٰ ہیں، اس کے علاوہ وہاں مشرقی زبانوں کا ایک علیحدہ مستقل مدرسہ ہے جو Ecole des langues orientales vevantes کے نام سے ۱۷۹۵ء سے قائم ہے اور درس و تدریس کے علاوہ مشرقی زبانوں اور ادبیات کے متعلق اعلیٰ پایہ کی سینکڑوں کتابیں شائع کر چکا ہے، ان اداروں کے علاوہ کئی ایسی سوسائٹیاں ہیں جہاں مستشرقین جمع ہو کر تبادلۂ خیالات کرتے ہیں اور باہمی تعاون سے علم کی حدود کو آئے دن وسیع کرتے رہتے ہیں، مثلاً فرانس کی (Societe Asiatique) ۱۸۲۲ء سے مصروف عمل ہے جس کا مشہور مجلہ (Journal Asiatique) تقریباً ۱۴۰ سال سے باقاعدگی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے اور بیش بہا معلومات کا خزینہ ہے، ایک خاص رسالہ اسلامی مسائل اور مباحث کے متعلق ہے جو ۱۹۲۶ء سے پروفیسر ماسینیون (Massignon) کی ادارت میں Revue des Etudes Islamiques کے نام سے شائع ہو رہا ہے اور اس سے پہلے Revue du monde musulman کے نام سے معروف تھا، ایک رسالہ Arabica کے نام سے علوم عربیہ کے ساتھ مخصوص ہے، جسے پروفیسر لوی پروونسال (Levi-Provencal) نے ۱۹۵۴ء میں جاری کیا اور جس میں عربی زبان کے اساتذہ اور محققین اپنے مقالات شائع کرتے رہتے ہیں، ان کے علاوہ پیرس میں کئی عجائب خانے ہیں جن میں مشرقی صنعت و حرفت اور فنون لطیفہ کے اعلیٰ اور نادر نمونے موجود ہیں، جن سے ان علوم کی تحقیق سے کام لیا جاتا ہے، غرض پیرس نہ صرف اپنے ظاہری جمال کے لحاظ سے عروس البلاد ہے بلکہ علمی کمال کے اعتبار سے بھی قبۃ العالم کہلانے کا مستحق ہے۔

اُردو شاعری

اور

فنِ تنقید

از

مولانا عبد السلام صاحب ندوی مرحوم

(۳)

یہ وہ مباحث تھے جو شاعری کی ہر صنف سے تعلق رکھتے ہیں، اس کے بعد مولانا حالی نے شاعری کی تین مشہور صنف یعنی غزل، قصیدہ اور مثنوی کے متعلق چند اصلاحی مشورے دیے ہیں، اور وہ سب کے سب نہایت مناسب اور قابل قبول ہیں، غزل کے متعلق ان کا،

(۱) پہلا مشورہ یہ ہے کہ "غزل میں جو عشقیہ مضامین باندھے جائیں وہ ایسے جامع الفاظ میں ادا کیے جائیں جو دوستی اور محبت کی تمام انواع و اقسام اور تمام جسمانی اور روحانی تعلقات پر حاوی ہوں اور جہاں تک ہو سکے کوئی لفظ ایسا نہ آنے پائے جس سے کھلم کھلا مطلوب کا مرد یا عورت ہونا پایا جائے، مثلاً کلاہ، چہرہ، دستار، جامہ، قبا، سبزۂ خط، زرگر پسر، مطرب پسر، مغبچہ، ترسابچہ یا محرم، کرتی، مہندی، چوڑیاں، چوٹی، موباف، آرسی، جھومر وغیرہ وغیرہ،

(۲) جس طرح عشقیہ مضامین غزل کے نیچر میں داخل ہیں، اسی طرح خمریات یعنی شراب اور اس کے لوازمات کا ذکر اور نیز فقہاء و زہاد پر طعن و تعریض کرنی اپنی میخواری و توبہ شکنی و

خرابات نشینی پر فخر کرنا اور اہل شرع اور اہل تقویٰ کے اعمال و اقوال میں عیب نکالنے اور اسی قسم کی اور باتیں جو عقل و شرع کے خلاف ہوں، غزل کے اجزاے غیر منفک قرار پا گئی ہیں، لیکن چونکہ شاعری کا جزو اعظم جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے یہ ہے کہ اس میں جو خیال باندھا جائے اس کی بنیاد اصلیت پر ہونی چاہیے، اس لیے اصول شاعری کے موافق شراب و کباب کے مضمون باندھنا صرف ان لوگوں کا حق ہونا چاہیے جو یا تو خود اس میدان کے مرد ہوں اور یا اپنے اصلی خیالات خمریات کے پیرایہ میں بطور مجاز و استعارہ کے ادا کر سکتے ہوں، نیز واعظ اور زاہد وغیرہ کو لتاڑنا اور ان پر نکتہ چینی کرنی ان ہی لوگوں کو زیبا ہے جن کو فی الواقع ان کے ساتھ کوئی وجہ مخالفت کی ہو، ہاں باوجود نہ ہونے کسی قسم کی مخالفت کے صرف ایک صورت سے واجبی طور پر ایسے مضامین باندھے جا سکتے ہیں، یعنی نکتہ چینی ایسے طریقہ سے کی جائے جس سے معلوم ہو کہ محض ریا و مکر و سالوس کی برائی بیان کرنی مقصود ہے،

(۳) مذکورہ بالا مضامین کے سوا اور جس بات کا سچا جوش اور ولولہ دل میں اٹھے اس کو بھی غزل میں بیان کر سکتے ہیں، اگرچہ اصل وضع کے لحاظ سے غزل کا موضوع عشق و محبت کے سوا کچھ نہیں ہے، لیکن ہمارے شعراء نے اس کو ہر مضمون کے لیے عام کر دیا ہے اور اب اس صنف کو مجازاً غزل کہا جاتا ہے، البتہ یہ ضرور نہیں کہ اس قسم کے جو خیالات اگلوں نے زمانہ کے اقتضاء سے یا اپنے جذبات کے جوش میں ظاہر کیے ہیں ہم بھی وہی راگ گاتے رہیں بلکہ ہم کو چاہیے کہ اپنی غزل کو خود اپنے خیالات اور اپنے جذبات کا آرگن بنائیں، الغرض غزل کو باعتبار مضامین اور خیالات کے جہاں تک ممکن ہو وسعت دینی چاہیے، قدما کے جو مضامین ناکمل ہیں ان کی تکمیل کرنی چاہیے، اور عربی، فارسی، انگریزی اور بھاشا و سنسکرت میں ہر قسم کے بلند، لطیف اور پاکیزہ خیالات کا جو ذخیرہ موجود ہے اس کو اردو غزل میں منتقل کرنا چاہیے،

اس غرض سے دوسرے زبانوں کے اشعار کا ترجمہ بھی کیا جا سکتا ہے اور یہ کوئی قابل اعتراض بات نہیں بلکہ اردو شعرائنے فارسی زبان کے متعدد اشعار کا ترجمہ اس خوبی سے کیا ہے کہ اس کو اصل مضمون پر تفوق حاصل ہوگیا ہے لیکن اس کے لیے ہمارے نزدیک اس کی ضرورت نہیں ہے کہ غزل میں ایسے مضامین داخل کیے جائیں جن کا غزل کے موضوع سے کوئی تعلق نہ ہو، اس لیے ہر ایک موسم کی کیفیت، صبح و شام کا سماں، چاندنی رات کا لطف، جنگل یا باغ کی بہار کے لیے تماشوں کی چہل پہل، قبرستان کا سناٹا، سفر کی روداد اور اسی قسم کی بہت سی باتیں اگرچہ مسلسل غزل میں بیان کی جا سکتی ہیں، لیکن درحقیقت ان کو موضوع غزل سے کوئی تعلق نہیں بلکہ اسکے لیے شاعری کی ایک مخصوص صنف ہے، جس کو عربی میں وصف کہتے ہیں اور غزل کی طرح اس زمانے میں اس صنف کو بھی وسعت و ترقی دیجا سکتی ہے،

(۴) لیکن مضامین کی اس وسعت و ترقی کے ساتھ غزل کی زبان میں دفعۃً کوئی تغیر نہیں پیدا کیا جا سکتا کیونکہ جس طرح ہماری غزل کے مضامین محدود ہیں، اسی طرح اس کی زبان بھی ایک خاص دائرہ میں محدود ہے، اور زبان کا ایک خاص حصہ ان کے ساتھ مخصوص ہوگیا ہے، اس لیے اگر ان الفاظ کی جگہ دوسرے الفاظ جو انہی کے ہم معنی ہوں استعمال کیے جائیں تو غریب اور اجنبی معلوم ہوں گے، یہی وجہ ہے کہ جن بزرگوں نے غزل کی بنیاد تصوف اور اخلاق پر رکھی ہے ان کو بھی وہی زبان اختیار کرنی پڑی ہے، جو غزل میں عموماً برتی جاتی ہے، لیکن یہ اسلوب زیادہ تر تصوف کے مضامین سے خصوصیت رکھتے ہیں، ہر قسم کے نیچرل خیالات ادا کرنے کے لیے صرف یہی اسلوب کافی نہیں ہو سکتے، اس لیے جہاں تک ممکن ہو استعارہ کنایہ اور تمثیل کے ذریعہ سے ان خیالات کے ادا کرنے پر قدرت حاصل کرنی چاہیے

(۵) شعر کی اصلی خوبی یہ ہے کہ نیچرل ہو، موثر ہو، لفظاً اور معناً سانچے میں ڈھلا ہوا ہو،

اگر اس کے ساتھ کوئی لفظی رعایت بھی اس میں پائی جائے تو اور بھی بہتر ہے، لیکن اس کے ساتھ یہ شرط ہے کہ اس صنعت کو ایسی بے تکلفی کے ساتھ استعمال کیا جائے کہ معنی مقصود میں کوئی خلل واقع نہ ہو بلکہ اس میں اور زیادہ قوت پیدا ہو جائے، مثلاً میر کے اس شعر میں

یہ جو چشم پر آب ہیں دونو
ایک خانہ خراب ہیں دونو

ایک کا لفظ جس کے معنی نہایت، بے مثل اور لاجواب بلکہ چھٹے ہوئے کے ہیں نہایت بے ساختہ اور بے تکلف واقع ہوا ہے اور دونو کے مقابلہ میں اس نے شعر کو بہت بلند کر دیا ہے، ورنہ نفس مضمون کے لحاظ سے یہ شعر نہایت معمولی درجہ کا ہے، اسی طرح اس شعر میں بھی

ایک سب آگ ایک سب پانی
دیدہ و دل عذاب ہے دونو

آگ اور پانی کا مقابلہ نہایت بے تکلفی سے واقع ہوا ہے اس لیے اگر اس قسم کی لفظی مناسبت اتفاق سے شعر میں پیدا ہو جائے تو یہ شاعری کا زیور ہے، لیکن اگر اس قسم کی رعایتوں کی پابندی یا مقصد و بالارادہ کی جائے اور اسی پر شعر و سخن کی بنیاد رکھی جائے، تو شاعری شاعری نہیں رہتی، بلکہ ہزل و تمسخر بن جاتی ہے، اگرچہ اس قسم کی بیہودہ لفظی صنعتیں جن میں معنی سے بالکل قطع نظر کر لیجاتی ہے، اور محض لفظوں کا گورکھ دھندا بنایا جاتا ہے جیسے منقوط، غیر منقوط، قطا، خفا، ذو قافیتین، ذو بحرین وغیرہ وغیرہ، اردو شاعری میں کمیاب ہیں، لیکن رعایت لفظی کا التزام شعرائے لکھنؤ نے کثرت سے کیا ہے، اس لیے ان کی شاعری کا ایک حصہ نہایت مبتذل اور رکیک ہوگیا ہے، اور ان سے احتراز کرنے کی سخت ضرورت ہے۔

(۶) رعایت لفظی اور صنائع و بدائع کی پابندی سے زیادہ مضمون کا خون کرنے والی

سنگلاخ زمینیں ہیں، جن کی ابتدا مصحفی اور انشا کے وقت سے ہوئی اور شاہ نصیر نے اس میں سب سے زیادہ طبع آزمائی کی، غزل میں جبکہ ردیف و قافیہ کی گھاٹی خود دشوار گذار ہے تو اس کو اور زیادہ کٹھن اور ناقابل گذار بنانا ان ہی لوگوں کا کام ہو سکتا ہے جو معنی سے کچھ سروکار نہیں رکھتے، جہاں تک سنگلاخ زمینوں کا استقرا کیا جاتا ہے ان میں یا تو ردیف و قافیہ ایسے اختیار کیا جاتا ہے جن میں باہم کچھ مناسبت نہ ہو، مثلاً تقریر پشت آئینہ، نخچیر پشت آئینہ اور جبل کی مکھی اور محل کی مکھی اور عسس کی تیلیاں، مگس کی تیلیاں، یا ردیف ایسی لمبی اختیار کرتے ہیں جو ایک آدھ سے زیادہ شعروں میں معقول طور پر نہیں آسکتی، جیسے فلک پہ بجلی، زمین پہ باراں، سر پہ طرہ، ہار گلے میں، غرض قصداً ایسی طرح تجویز کرتے ہیں جس میں عمدہ مضمون بندھنا تو یقیناً ناممکن ہو، اس لیے شاعر کو چاہیے کہ ردیف ہمیشہ ایسی اختیار کرے جو قافیہ سے میل کھاتی ہو، اور ردیف و قافیہ دونوں ملکر دو مختصر کلموں سے زیادہ نہ ہوں، بلکہ رفتہ رفتہ مردف غزلیں لکھنی کم کرنی چاہئیں اور سرد محض قافیہ پر قناعت کرنی چاہیے، اور قافیہ ایسا اختیار کرنا چاہیے جس کے لیے قدر ضرورت سے دس گنے بلکہ بیس گنے الفاظ موجود ہوں، ورنہ مضمون کو قوافی کا تابع کرنا پڑے گا، قافیے مضمون کے تابع نہ ہوں گے،

قصیدہ، مولانا کے نزدیک شعر کی ایک نہایت ضروری صنف ہے، اکثر اوقات کسی چیز کو دیکھکر یا کسی واقعہ کو سنکر بے اختیار ہمارے دل میں مدح و ستایش یا نفرین و ملامت کا جوش اٹھتا ہے، غرض اس قسم کے بہت مواقع پیش آتے ہیں جہاں ہمارے دل میں کسی کی بھلائی اور برائی کے بیان کرنے کا سچا جوش پیدا ہوتا ہے، ایسے موقعوں پر شاعر کا فرض ہے کہ شاعری کا جو ملکہ فطرۃً اس کو عطا کیا گیا ہے اس کو معطل و بیکار نہ چھوڑے تاکہ جو لوگ مدح کے مستحق ہیں انکو مدح کا زیادہ استحقاق حاصل کرنے یا کم سے کم اپنا پہلا استحقاق قائم رکھنے کا اور دوسروں کو

اس کی ریس کا خیال پیدا ہو اور جو لوگ نفرین کے مستحق ہیں وہ اس اندیشہ سے کہ مبادا آئندہ زیادہ رسوائی نہ ہو اپنی اصلاح کی طرف متوجہ ہوں،

شعرائے جاہلیت نے مدح و ذم میں جو قصائد لکھے ہیں وہ اسی قسم کے سچے جوش اور سچے واقعات پر مشتمل ہیں متوکل باللہ نے ایک شاعر سے پوچھا کہ تم ہجو و مدح کب کرتے ہو؟ اس نے کہا "اذا اساؤا و احسنوا" یعنی جب لوگوں سے بدی اور نیکی سرزد ہوتی ہے، لیکن اس حیثیت سے ہمارے قصائد کی حالت ناگفتہ بہ ہے ان کی بنیاد جوش و صداقت پر نہیں بلکہ محض تقلید پر ہے، مدح میں زیادہ تر وہی معمولی محامد بیان ہوتے ہیں جو قدیم سے شعرا باندھتے چلے آتے ہیں اور ہر ایک خوبی کے بیان میں ایسا مبالغہ کیا جاتا ہے کہ قصیدہ کا مصداق نفس الامر میں کوئی انسان قرار نہیں پا سکتا، ممدوح کی ذات میں جو واقعی خوبیاں ہوتی ہیں ان سے اصلاً تعرض نہیں کیا جاتا بلکہ بجائے ان کے ایسی محال باتیں بیان کی جاتی ہیں جو کسی متنفس پر صادق نہ آسکیں، ممدوح کی طرف اکثر وہ خوبیاں منسوب کی جاتی ہیں جن کے اضداد اس کی ذات میں موجود ہیں، مثلاً ایک جاہل کو علم و فضل کے ساتھ، ایک ظالم کو عدل و انصاف کے ساتھ، ایک احمق اور غافل کو دانشمندی اور بیدار مغزی کے ساتھ، ایک عاجز بیدست و پا کو قدرت و مکنت کے ساتھ، ایک ایسے شخص کو جس کی ران نے کبھی گھوڑے کی پیٹھ کو مس نہیں کیا شہسواری اور فروسیت کے ساتھ، غرض کوئی بات ایسی نہیں بیان کی جاتی جس پر ممدوح فخر کر سکے! جس سے لوگوں کے دل میں اس کی عظمت اور محبت پیدا ہو، اور اس کے محاسن و مآثر زمانہ میں یادگار رہیں"، اور ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہے کہ شاعری کی جو تین ضروری شرطیں ہیں یعنی سادگی جوش اور اصلیت ان سے ہمارے قصائد بالکل خالی ہیں،

مرثیہ بھی مدحیہ قصائد ہی کی ایک قسم ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ زندوں کی تعریف کو قصیدہ اور مردوں کی تعریف کو جس میں تاسف اور افسوس بھی شامل ہو مرثیہ کہتے ہیں،

لیکن اردو میں مرثیہ کا اطلاق زیادہ تر شہدائے کربلا اور خاصکر جناب سید الشہداءؑ کے مرثیہ پر ہوتا ہے۔ اور اردو زبان میں مرثیہ کی ابتدا، بالکل قدرتی اصول پر ہوئی یعنی میت کو یاد کرکے حزن وغم کا اظہار کرنا اور اپنے بیان سے دوسروں کو مغموم کرنا، اسی بناء پر اول اول جو مرثیے لکھے گئے وہ کم وبیش بیس تیس بند یا بیس تیس بیت سے زیادہ نہ ہوتے تھے اور ان میں مرثیت یا بین کے سوا اور کچھ نہ ہوتا تھا، لیکن رفتہ رفتہ مرثیہ کی لے بہت بڑھ گئی یہانتک کہ خواجہ حیدر علی آتش نے مرزا دبیر کا ایک مرثیہ مجلس میں سنکر تعجب سے کہا کہ یہ مرثیہ تھا یا سندہور بن سعدان کی داستان تھی؟ اگرچہ یہ ترقی براہ راست مرثیہ کی ترقی نہ تھی بلکہ اردو شاعری میں ایک قسم کی ایجاد تھی کہ جس نظم کی بنیاد محض بین اور مرثیہ پر ہونی چاہیے تھی اس میں بین اور مرثیت کے علاوہ مدح وقدح، فخر ومباہات، رزم وبزم بھی نہایت شد ومد کے ساتھ شامل ہوگئی، لیکن حق یہ ہے کہ اس نئی طرز کی نظم سے اردو شاعری میں بیحد وسعت پیدا ہوگئی، اور اردو شاعری میں بیان کے نئے نئے اسلوب نہایت کثرت سے پیدا ہوگئے،

اخلاقی حیثیت سے بھی مرثیہ کا پایہ نہایت بلند ہے۔ اور ایثار، قربانی، حق پرستی، حق گوئی اور صبر وتحمل کی جو اخلاقی مثالیں مرثیوں میں ملتی ہیں وہ اخلاقی کتابوں میں بھی بمشکل مل سکتی ہیں، لیکن باوجود ان تمام خوبیوں کے مولانا حالی نئی دھن کے شاعروں کو یہ صلاح نہیں دیتے کہ مرثیہ گوئی میں مرثیہ گویوں کا اتباع کریں، اخلاقی حیثیت سے اس قسم کی اخلاقی نظموں کا انسان کے دل پر جو اثر ہونا چاہیے وہ ان مرثیوں کے سننے والوں کے دل پر نہ ہوتا ہے اور نہ ہو سکتا ہے، اول تو یہ خیال کہ مرثیہ کا اصل مقصد صرف رونا اور رلانا ہے سامعین کو دوسری طرف متوجہ ہی نہیں ہونے دیتا دوسرے یہ اعتقاد کہ جو کچھ صبر واستقلال وشجاعت

وہمدردی ووفاداری وغیرت وحمیت وعزم بالجزم اور دیگر اخلاق فاضلہ خود امام ہمام اور ان کے عزیزوں اور دوستوں سے معرکۂ کربلا میں ظاہر ہوئے وہ مافوق طاقت بشری اور خوارق عادات سے تھے، کبھی ان کی پیروی اور اقتدا کرنے کا تصور بھی دل میں آنے نہیں دیتا

شاعرانہ حیثیت سے مرثیہ میں رزم بزم اور فخر وخودستائی اور سراپا وغیرہ کو داخل کرنا، لمبی لمبی تمہیدیں اور قوطیہ باندھنے، گھوڑے اور تلوار وغیرہ کی تعریف میں نازک خیالیاں اور بلند پروازیاں کرنی اور شاعرانہ ہنر دکھانے مرثیہ کے موضوع کے بالکل خلاف ہیں، اور بعینہ ایسی بات ہے کہ کوئی شخص اپنے باپ یا بھائی کے مرنے پر اظہار حزن وملال کے لیے سوچ سوچ کر رنگین اور مسجع فقرے انشا کرے اور بجائے حزن وملال کے اپنی فصاحت کے جوہر دکھائے، اس کے علاوہ مرثیہ کو صرف واقعہ کربلا کے ساتھ مخصوص کرنا اور تمام عمر اسی ایک مضمون کو دہراتے رہنا اگر محض بہ نیت حصول ثواب ہو تو کچھ مضائقہ نہیں، لیکن شاعری کے فرائض اس سے زیادہ وسیع ہونے چاہئیں، اور اکابر قوم کے مرثیے لکھکر قوم میں قومیت کی روح پھونکنی چاہیے،

مثنوی مولانا کے نزدیک شاعری کی ایک نہایت اہم صنف ہے، اور اس میں ہر قسم کے مسلسل مضامین جو غزل، قصیدہ، مسدس، ترکیب بند اور ترجیع بند میں ادا نہیں کیے جاسکتے، نہایت خوبی کے ساتھ ادا کیے جاسکتے ہیں، لیکن عربی زبان میں چونکہ یہ صنف موجود نہیں ہے، اس لیے عربی زبان کی تنقیدی کتابوں میں اس کے حسن وقبح کے اصول مذکور نہیں ہیں، فارسی زبان کے تنقید نگاروں نے بھی چونکہ عربی ہی کی تنقیدی کتابوں کی تقلید کی ہے اس لیے ان کے یہاں بھی اس قسم کے اصول نہیں ملتے، مولانا حالی پہلے تنقید نگار ہیں جنھوں نے مثنوی کے لیے چند تنقیدی اصول قائم کیے ہیں، اور ان اصول کے مطابق اردو کی چند مشہور مثنویوں پر

تنقید کی ہے، ان میں

(۱) سب سے مقدم ربط کلام ہے، جو کہ مثنوی اور ہر مسلسل نظم کی جان ہے، غزل اور قصیدہ میں ایک شعر کو دوسرے شعر سے جیسا کہ ظاہر ہے کچھ ربط نہیں ہوتا، بخلاف مثنوی کے کہ اس میں ہر بیت کو دوسرے بیت سے ایسا تعلق ہونا چاہیے جیسے زنجیر کی ہر کڑی کو دوسری کڑی سے ہوتا ہے، اس لیے مثنوی لکھنے والے کا سب سے مقدم فرض یہ ہے کہ بیتوں اور مصرعوں کی ترتیب ایسی سنجیدہ ہو کہ ہر مصرع دوسرے مصرع سے اور ہر بیت دوسری بیت سے چسپاں ہوتی چلی جائے اور دونوں کے بیچ میں ایسا کھانچا باقی نہ رہ جائے کہ جب تک کچھ عبارت مقدر نہ مانی جائے، تب تک کلام جیسا کہ چاہیے مربوط نہ ہو، مثلاً گلزار نسیم میں ہے:-

خوش ہوتے تھے طفل مہ جبیں سے — ثابت یہ ہوا ستارہ بیں سے

پیارا یہ وہ ہے کہ دیکھ اسی کو — پھر دیکھ نہ سکے گا کسی کو

جو مطلب کہ صاحب مثنوی ادا کرنا چاہتا ہے وہ یہ ہے کہ "لوگ تو اس طفل مہ جبین کو دیکھکر خوش ہوتے تھے، مگر نجومیوں نے بادشاہ سے کہا کہ یہ لڑکا آپ کا پیارا تو ہے مگر یہ ایسا پیارا ہے کہ اس کو دیکھکر پھر کسی کو نہ دیکھ سکیگا، کیونکہ اس کو دیکھتے ہی بینائی جاتی رہے گی" لیکن ظاہر ہے کہ ان دونوں بیتوں میں جب تک کہ کئی الفاظ بڑھائے نہ جائیں اور کئی لفظ بدلے نہ جائیں تب تک یہ مطلب جو اوپر بیان کیا گیا ان بیتوں سے سیدھی طرح نہیں نکل سکتا، اور پہلا مصرع دوسرے مصرع سے اور دوسرا مصرع تیسرے مصرع سے چسپاں نہیں ہوسکتا،

اس قسم کی بے ربطی اس مثنوی کے اور بھی متعدد اشعار میں موجود ہے،

(۲) دوسرا اصول یہ ہے کہ جو قصہ مثنوی میں بیان کیا جائے اس کی بنیاد ناممکن اور مافوق العادۃ باتوں پر نہ رکھی جائے، اگرچہ اس حیثیت سے قدیم مثنویوں پر کوئی تنقید نہیں کی جاسکتی

لیکن اس زمانے میں اس قسم کی باتوں کا دل پر کوئی اثر نہیں پڑتا بلکہ اس کے برعکس اُن پر ہنسی آتی ہے

(۳) تیسرا اصول یہ ہے کہ مبالغہ سے احتراز کیا جائے اور انتہا سے انتہا درجہ کا مبالغہ بھی اس سے زیادہ نہ ہو کہ جو کچھ کسی کی مدح وذم میں کہا جائے گو وہ اس چیز کے حق میں صحیح نہ ہو مگر کسی نہ کسی چیز پر صادق آسکتا ہو، نہ یہ کہ دنیا میں کوئی چیز اس کی مصداق نہ ہو اور مبالغہ کی غایت یہ ہونی چاہیے کہ جو مطلب بیان کرنا منظور ہے مبالغہ کی وجہ سے اس کا اثر سامع کے دل پر نہایت قوت کے ساتھ ہو، نہ یہ کہ اس کا رہا سہا یقین بھی جاتا رہے، مثلاً کسی پر رونق بازار کی نسبت یہ کہنا کہ وہاں صبح سے شام تک کٹورا بجتا ہے (اگرچہ وہاں کسی وقت بھی کٹورا نہ بجتا ہو) اور ایک اس کی تعریف اس طرح کرنی،

رات دن جمگھٹا ہے میلا ہے

مہر و مہ کا کٹورا بجتا ہے

یا مثلاً ایسے بازار کی نسبت ایک تو یہ کہنا کہ "وہاں چھڑکاؤ سے ہر وقت زمین نرم رہتی ہے" اور ایک یہ کہ وہاں گلاب اور کیوڑے کا نہیں بلکہ آب گوہر کا چھڑکاؤ ہوتا ہے،

اگرچہ ہمارے نزدیک تنقید کا یہ اصول مثنوی ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، بلکہ شاعری کی ہر صنف کے لیے ضروری ہے تاہم چونکہ مثنوی کی بنیاد زیادہ تر واقعات پر ہوتی ہے، اس لیے اس قسم کے دوراز کار مبالغوں سے واقعہ کو واقعہ ہی نہ رہنے دیں، مثنوی میں اور بھی زیادہ شدت کے ساتھ احتراز کرنا چاہیے،

(۴) چوتھا اصول یہ ہے کہ قصے کے بیان کرنے میں بلاغت کا سررشتہ ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے اور کوئی بات مقتضائے حال کے خلاف نہ کہی جائے، مولانا نے مثنوی طلسم الفت

سے اس قسم کی متعدد مثالیں جمع کی ہیں، جو بالکل مقتضائے حال کے خلاف ہیں، مثلاً جہاں بادشاہ بادشاہ حسن آباد اور اس کی بڑھیا ملکہ بیٹیوں کے عقد کے معاملے باہم مشورہ کررہے ہیں اس کا بیان اس مثنوی میں اس طرح کیا گیا ہے،

ایک دن بادشاہ حسن آباد اندرون محل تھا بادل شاد
اپنی بی بی سے گرم خلوت تھا محو راحت تھا مست عشرت تھا
اس پری رو نے تخلیہ پاکر عرض کی اختلاط میں آکر
لڑکیوں کا نہیں کچھ آپکو دھیان ہو چکی ہیں سلامتی سے جوان
اور باتوں کا تو نہیں کچھ غم ہاں مگر یہ خیال ہے ہر دم
کہ میں بیٹھی ہوئی ہوں پا بر کاب طاقت جسم دے چکی ہے جواب
سب مہیا ہیں کوچ کے سامان اور دو چار دن کی ہوں مہمان

لیکن اس تقریر میں اکثر الفاظ مقتضائے حال کے خلاف استعمال کیے گئے ہیں، بادشاہ خود شیخ فانی ہے اور اس کی ملکہ بھی عجوزۂ سالخوردہ ہے، وہ خود جابجا کہتی ہے کہ میں پا در رکاب اور چند روز کی مہمان ہوں، باوجود اس کے ایسے الفاظ استعمال کرنے کہ "اپنی بی بی سے گرم خلوت تھا"، محو راحت تھا مست عشرت تھا۔" یا "اس پری رو نے یعنی بڑھیا نے اختلاط میں آکر عرض کی بادشاہ کا اپنی بڑھیا ملکہ کو کہیں اے ماہ اور کہیں اے حور کہنا، یہ سب باتیں مقتضائے حال کے خلاف ہیں، نواب مرزا شوق لکھنوی نے لذت عشق میں بھی بعض موقعوں پر مقتضائے حال کا لحاظ نہیں رکھا ہے، اور اسکے خلاف باتیں لکھی ہیں،

(۵) پانچواں اصول یہ ہے کہ جو حالت کسی شخص یا کسی چیز یا کسی مکان وغیرہ کی بیان کیجائے وہ لفظاً ومعناً نیچرل یعنی عادت کے موافق ایسی ہونی چاہیے جیسی کہ فی الواقع ہوا کرتی ہے،

مثلاً میر حسن نے ایک موقع پر جدائی کی حالت کا بیان اس طرح کیا ہے،

خفا زندگانی سے ہونے لگی بہانے سے جا جا کے سونے لگی
ٹھہرنے لگا جان میں اضطراب لگی دیکھنے وحشت آلودہ خواب
نہ اگلا سا ہنسنا نہ وہ بولنا نہ کھانا نہ پینا نہ لب کھولنا
جہاں بیٹھنا پھر نہ اٹھنا اسے محبت میں دن رات گھٹنا اسے
کہا گر کسی نے کہ بیوی چلو تو اٹھنا اسے کہہ کے ہاں جی چلو
جو پوچھا کسی نے کہ کیا حال ہو تو کہنا یہی ہے جو احوال ہو
کسی نے جو کچھ بات کی بات کی یہ دن کی جو پوچھی کہی رات کی

ان اشعار میں بہانہ سے جا جا کے سونا، وحشت آلودہ خواب دیکھنا، جہاں بیٹھنا پھر وہاں سے نہ اٹھنا، اگر کسی نے اٹھنے کو کہا تو اٹھ کھڑا ہونا نہیں تو بیٹھے رہنا، کسی نے حال پوچھا تو خیر و عافیت کہدی، کسی نے بات کی تو جواب دیدیا مگر بے ٹھکانے، یہ سب ایسی سچی اور پتے کی باتیں ہیں جو ہمیشہ ایسی حالتوں میں واقع ہوا کرتی ہیں، لیکن جو لوگ صنعت الفاظ پر فریفتہ ہوتے ہیں اور لفظی مناسبتوں پر جان دیتے ہیں وہ کبھی کسی نیچرل حالت کی تصویر نہیں کھینچ سکتے۔

یہی جدائی اور انتظار کا بیان مثنوی طلسم الفت میں اس طرح کیا گیا ہے:

شرم اس کو حیا سے آنے لگی بے حجابی کے ناز اٹھانے لگی
کم وقاری کی قدر بڑھنے لگی چشم تر بھی نظر پہ چڑھنے لگی
ٹھنڈی سانسوں کا دم وہ بھرنے لگی سوز الفت کا پاس کرنے لگی
پان کے بدلے خون دل کھانا دیکھ کر مہندی پانوں پھیلانا
رات دن ہمکلام خاموشی یاد ہر دم نہ خود فراموشی

گرم صحبت بھی سرد آہوں سے | سرمہ بھی گر گیا نگاہوں سے

ناتوانی بھی زور کرنے لگی | لاغری فکر گور کرنے لگی

ان اشعار میں کوئی بات سیدھی طرح نہیں بیان کی ہے، مثلاً "اس کو کسی کی شرم باقی نہیں رہی تھی"، اس کو یوں بیان کیا ہے کہ "اس کو شرم سے شرم آنے لگی"، یا "رات دن خاموش رہتی تھی"، اس کی جگہ "وہ خاموشی سے ہمکلام رہتی تھی"، یا "وہ خود فراموش رہتی تھی"، اس کی جگہ "اس کو خود فراموشی یاد رہتی تھی"، غرض کل اشعار کا حال جیسا کہ ظاہر ہے ایسا ہی ہے یا اس سے بھی زیادہ ژولیدہ اور ان نیچرل،

مثنوی گلزار نسیم میں بھی لفظی رعایتوں کا اکثر التزام کیا گیا ہے، وہ بھی بکاولی کا حال تاج الملوک کے فراق میں اس طرح بیان کرتا ہے:-

کرتی تھی جو بھوک پیاس بس میں | آنسو پیتی تھی کھا کے قسمیں

جامہ سے جو زندگی کے تھی تنگ | کپڑوں کے عوض بدلتی تھی رنگ

کچھ نہ جو گذری بجز دو خواب | زائل ہوئی اسکی طاقت و تاب

صورت میں خیال رہ گئی وہ | ہیات میں مثال رہ گئی وہ

اس بیان میں بھی تیسرے شعر کے سوا باقی تین شعروں کا مطلب کچھ نہیں معلوم ہوتا اور بظاہر اس نے کوئی مطلب رکھا بھی نہیں، اس کو تو فقط یہ لطیفہ بیان کرنا مقصود ہے کہ کھانے کی جگہ قسمیں کھاتی تھی، پینے کی جگہ آنسو پیتی تھی، اور کپڑوں کے عوض رنگ بدلتی تھی،

(۶) قصہ میں اس بات کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہے کہ ایک بیان دوسرے بیان کی تکذیب نہ کرے، اس اصول کے ذہن نشین کرنے کے لیے ہم چند شعر مثنوی چشم الفت کے

نقل کرتے ہیں، ایک قصہ گو شاہزادہ عشق آباد یعنی جانِ جہاں سے حسن آباد کی شہزادی عالم آرا کا حال اپنی آنکھوں کا دیکھا بیان کرتا ہے کہ جب میں حسن آباد میں پہنچا تو ایک شخص نے مجھ سے عالم آرا کے حسن و جمال کا ذکر کرنے کے بعد یہ کہا:

دیکھنا بھی تو اس کا مشکل ہے | کہ وہ لیلی میانِ محمل ہے

آدمی کیا ملک سے پردہ ہے | بلکہ چشم فلک سے پردہ ہے

اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو بڑے اہتمام سے پردہ میں رکھا جاتا ہے مگر اسی بیان میں اس کا ذکر ہوتے ہوتے یہ ارشاد ہوتا ہے کہ باغ میں جب دریچہ میں جا کر بیٹھتی ہے وہاں

تر بام اژدہام رہتا ہے | مجمع خاص و عام رہتا ہے

مشق جور و ستم کسی پر ہے | چشم لطف و کرم کسی پر ہے

ناز سے ایک سے کلام کیا | ایک کو غمزہ سے تمام کیا

وصل کا ایک سے کیا اقرار | ایک مشتاق سے کیا انکار

غرض دور تک ایسے ہی اشعار جن سے نہ صرف بے پردگی بلکہ غایت درجہ کا بیسواپن پایا جاتا ہے، چلے جاتے ہیں، اس بیان میں اور اوپر کے دونوں شعروں کے بیان میں جو منافات ہے، وہ ظاہر ہے، ایسی مثالیں اس مثنوی میں اور گلزار نسیم میں بہت ہیں مگر اور مثنویاں بھی اس سے بالکل پاک نہیں ہیں،

(۷) اس بات کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے کہ قصہ کے ضمن میں کوئی بات ایسی بیان نہ کی جائے جو تجربہ اور مشاہدہ کے خلاف ہو، مثلاً مثنوی طلسم الفت میں جہاں شاہزادہ جان کا جہاز غرق ہوا ہے اور جانِ جہاں اور سب اہل جہاز ڈوب چکے ہیں، اس طرح بیان کرتا ہے:

دوسرے دن وہ گوہر یکتا جھیل کر محنتِ محیط بلا

مثل خورشید ڈوب کر نکلا زندہ اک تختہ پہ مگر نکلا

یعنی جان جہاں ایک رات اور ایک دن ڈوبے رہنے کے بعد زندہ دریا سے نکلا اور نکلا بھی ایک تختہ پر بیٹھا ہوا، اول تو ایک عرصہ کے بعد زندہ نکلنا اور پھر قعر دریا سے ایک تختہ پر بیٹھے ہوئے نکلنا بالکل تجربہ اور مشاہدہ کے خلاف ہے،

(باقی)

تبع تابعین جلد اوّل

علم و عمل اور مذہب و اخلاق میں جس طرح صحابۂ کرامؓ کے جانشین اور تربیت یافتہ تابعین عظام تھے، اور صحابۂ کرام کے بعد انھی کی زندگی ملتِ اسلامیہ کے لیے نمونۂ عمل ہیں، بالکل اسی طرح تابعین کرام کے جانشین اور ان کے فیض یافتہ تبع تابعین تھے، سیر الصحابہ کے سلسلہ کی تکمیل کے بعد دار المصنفین "تابعین" کے نام سے تابعین کے مقدس گروہ کے حالات کا مرقع پیش کر چکا ہے، اب اس نے ان کے بعد کے مقدس بزرگوں کا مرقع تیار کیا ہے، اس کے دو حصے ہیں، پہلے حصہ میں امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے جلیل القدر تلامذہ ان کے فقہی مسلک کے علمبردار امام ابو یوسف امام محمد شیبانی، امام زفر کے علاوہ امام اوزاعی، ابن جریج، یحییٰ بن آدم اور فضیل بن عیاض وغیرہ کے سوانح اور ان کے علمی مذہبی، اخلاقی کارناموں اور مجتہدات کی تفصیل بیان کی گئی ہے، اس کا دوسرا حصہ جس میں ائمہ ثلاثہ امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہم وغیرہ کے حالات ہیں۔

(مرتبہ مولانا حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی)

منیجر

اقبالؒ اور حدیثِ نبویؐ

از

جناب ڈاکٹر اکبر حسین صاحب قریشی

اقبال حکیم ملت ہیں، شاعر مشرق ہیں، مفکر اسلام ہیں، انھیں شریعت اور صاحب شریعت سے جو والہانہ عقیدت ہے، وہ محتاج بیان نہیں، زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں، جہاں انھوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کو مشعل راہ نہ بنایا ہو، اسرار خودی سے لیکر ارمغان حجاز تک انکے کلام میں جابجا احادیث رسول کے حوالے ملتے ہیں، کہیں تو انھوں نے احادیث کے الفاظ تک لے لیے ہیں اور کہیں صرف حدیث کے مفہوم کی طرف اشارہ کیا ہے، اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اقبال کے یہاں شروع ہی سے حدیث نبوی کو بڑی اہمیت حاصل ہے، اور یہ سلسلہ آخر تک جاری رہتا ہے، بلکہ انتقال کے قریب تو صورتِ حال یہ ہوگئی تھی کہ جب کبھی دوران گفتگو میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی آجاتا تو ان کی آنکھیں پرنم ہو جاتیں، ابھی بہت سے لوگ ایسے موجود ہیں جنھوں نے اقبال کی اس کیفیت کا بچشم خود مشاہدہ کیا ہے، اقبال نے اپنی فہم، اپنی فکر، اور اپنی بصیرت سے اسلام کی ایسی خدمت کی جو انھی کا حصہ ہے،

مگر ایک گروہ ایسا بھی ہے جو یہ سمجھتا ہے کہ اقبال قرآن مجید کو اتنا مکمل نظام حیات سمجھتے تھے کہ کسی درجے میں بھی حدیث کے قائل نہ تھے، محض خوش فہمی ہے، حقیقت پسندی نہیں، ان کے کلام اور زندگی سے بالکل عیاں ہے کہ وہ حدیث کے اسی طرح قائل و معترف تھے جس طرح

ایک مومن کو ہونا چاہیے، اس باب میں ان میں کوئی تزلزل نہ تھا، اس مضمون کا مقصد ان کے کلام سے اس کے شواہد پیش کرنا ہیں،

اس میں اقبال کی کتابوں کی ترتیب تاریخی رکھی گئی ہے، مثلاً اسرار خودی کو سب سے پہلے رکھا گیا ہے، اگرچہ بانگ درا میں اسرار سے بہت پہلے کی نظمیں اور غزلیں شامل ہیں لیکن چونکہ بانگ درا پہلی مرتبہ ۱۹۲۴ء میں شائع ہوئی اس لیے اسے اسرار کے بعد رکھا گیا ہے، تاریخی ترتیب کے علاوہ ہر کتاب کے حوالے کے ساتھ ساتھ اس کا سالِ طباعت بھی دیدیا گیا ہے، مقالے کی تحریر میں اقبال کی ان کتابوں کے حوالے ہیں جو لاہور سے شائع ہوئے ہیں،

اب اس دعوے کے ثبوت میں وہ اشعار پیش کیے جاتے ہیں جنمیں احادیث رسول کیطرف اشارہ ہے:

من چہ گویم از تو لایش کہ چیست　　خشک چوبے در فراق او گریست [1]

اس شعر کے مصرع ثانی میں مندرجۂ ذیل حدیث کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے:۔

عن جابر قال کان النبی صلی اللہ	حضرت جابرؓ کہتے ہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ
علیہ وسلم واذا خطب استند الی	دیتے وقت مسجد کے ستونوں میں سے کھجور
جذع نخلۃ من سواری المسجد	کے ایک تنے سے ٹیک لگالیا کرتے تھے،
فلما وضع لہ المنبر فاستوی علیہ	لیکن جب آپ کے لیے منبر تیار کر دیا گیا تو آپ اس پر
صاحت النخلۃ التی کان یخطب عندھا	خطبہ دینا شروع کر دیا، اب وہ کھجور کا تنا
حتی کادت ان تنشق فنزل النبی	اتنا چیخکر رویا کہ پھٹنے کے قریب ہوگیا، یہ حال
صلی اللہ علیہ وسلم حتی اخذھا فضمھا	دیکھکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منبر سے اتر کر
الیہ فجعلت تان انین الصبی الذی	اس تنے کو سینے سے لگالیا تو وہ اس طرح
یسکت حتی استقرت قال بکت	سسکیاں لینے لگا جیسے وہ بچہ سسکیاں

[1] اسرار خودی ص ۲۲ طبع سوم ۱۹۴۰ء

علی ما کانت تسمع من الذکر	لیتا ہے جو چپ کرایا جاتا ہے، بالآخر وہ چپ
	ہوگیا، راوی کا بیان ہے کہ تنا اس لیے رویا
(مشکوٰۃ ص ۵۳۵ مطبع مجتبائی دہلی)	کہ وہ وعظ و نصیحت سنا کرتا تھا۔

خود فرود آ از شتر مثلِ عمر　　الحذر از منتِ غیر الحذر [1]

اس شعر میں حضرت عمرؓ کی طرف جس واقعہ کو منسوب کیا گیا ہے، کتبِ احادیث میں اسکی نسبت دوسرے حضرات کی طرف کی گئی ہے، وہ واقعہ یہ ہے:

قال فکان ثوبان یضیع سوطہ	(ابن ماجہ ص ۱۳۳)	حضرت ثوبانؓ سے سواری کی حالت میں
وھو راکب فلا یقول لاحد ناولنیہ		جب کوڑا گر جاتا تو کسی سے اٹھانے کے لیے
حتی ینزل فیاخذہ		نہیں کہتے تھے بلکہ خود اتر کر اٹھا لیتے،
عن ابی ذر قال دعانی		حضرت ابوذرؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلعم
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وھو		نے مجھ کو بلایا اور یہ شرط کی کہ کبھی میں کسی سے
یشترط علی ان لا تسئل الناس شیئا		چیز کا سوال نہ کروں، میں نے عرض کیا بہت اچھا
قلت نعم قال ولا سوطک ان	(مسند احمد ج ۵ ص ۱۷۲)	آپ نے فرمایا کہ اگر تمھارا کوڑا گر جائے
سقط منک حتی تنزل الیہ فتاخذہ		تو وہ بھی کسی سے نہ مانگو بلکہ خود اتر کر اٹھا لو،
فلقد کان بعض اولئک النفر	(مجمع الزوائد ج ۳)	روایت ہے کہ بعض صحابہ ایسے تھے جن کا
یسقط سوطہ فما یسئل احداً		اگر کوڑا گر جاتا تو اس کو بھی کسی سے اٹھانے
ان یناولہ ایاہ (ابو داؤد عن المغیرۃ)		کے لیے نہیں کہتے تھے۔

مذکورۂ بالا دو روایتوں میں تو نام کی تصریح ہے، پہلی میں حضرت ثوبانؓ کے عمل کا ذکر ہے اور دوسری میں حضرت ابوذر غفاریؓ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا، اس سے ظاہر ہے کہ انکو بھی

[1] اسرار خودی ص ۴۴

بعض ایسے اتفاقات ضرور پیش آتے ہوں گے جن میں انھوں نے اپنے محبوب کے ارشاد کی تعمیل کی ہوگی

تیسری روایت ابوداؤد کی ہے جس میں متعدد اصحاب کا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں اس عہد کے وقت حاضر ہونا معلوم ہوتا ہے، ممکن ہے کہ ان میں حضرت عمرؓ بھی ہوں، اگرچہ نام کی تصریح نہیں ہے،

پنجۂ او پنجۂ حق می شود ماہ از انگشت او شق می شود[1]

اس شعر کے پہلے مصرع میں حدیث قرب نوافل اور دوسرے مصرع میں معجزۂ شق القمر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے،

لایزال العبد یتقرب الی بالنوافل حتی احبه فاذا احببت کنت سمعه الذی یسمع به و بصره الذی یبصر به ویده التی یبطش بها

(مشکوٰۃ ص ۱۹۷)

بندہ نوافل کے ذریعے سے مجھ سے قربت حاصل کرنے کے لیے مسلسل کوشش کرتا رہتا ہے یہانتک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں اور جب میں اس سے محبت کرتا ہوں تو اسکا کان بنجاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور اسکی آنکھ بنجاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور اسکا ہا

عن ابن مسعود بینما نحن مع النبی صلے اللہ علیہ وسلم بمنی اذا انفلق القمر فلقتین فلقة وراء الجبل وفلقة دونه فقالنا صلے اللہ علیہ وسلم اشهدوا

(جمع الفوائد ج ۲ ص ۲۰۰ طبع میرٹھ)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ ہم رسول کریم کے ساتھ منیٰ میں تھے کہ (کفار مکہ کے معجزہ طلب کرنے پر آپکی انگلی کے اشارے سے) چاند کا ایک ٹکڑا پہاڑ کے پیچھے چلا گیا اور دوسرا (پہاڑ کے) اس طرف رہ گیا، اس وقت آپ نے ہماری طرف مخاطب ہوکر فرمایا گواہ رہو۔

[1] اسرار ص ۷۰

ذات او دروازۂ شہر علوم زیر فرمانش حجاز و چین و روم[2]

اس شعر کے پہلے مصرع میں اس حدیث کی طرف اشارہ ہے جس میں رسول کریم نے حضرت علیؓ کو علم کا دروازہ فرمایا ہے

انا مدینة العلم وعلی بابها

میں علم کا شہر ہوں اور علی اسکا دروازہ ہے

خاک گشتن مذہب پروانگی است خاک را اب شو کہ این مردانگی است

یہاں حضرت علیؓ کی کنیت (ابوتراب) کی طرف تلمیح کی گئی ہے

عن سهل ابن سعد قال دخل علی علی فاطمة ثم خرج فاضطجع فی المسجد فقال النبی صلی اللہ علیه وسلم این ابن عمك قالت فی المسجد فخرج الیه فوجد رداءه قد سقط عن ظهره وخلص التراب الی ظهره فجعل یمسح عن ظهره فیقول اجلس یا اباتراب مرتین

(بخاری ج ۱ ص ۵۲۵، مجتبائی)

حضرت سہل ابن سعد سے روایت ہے کہ حضرت علیؓ ایک مرتبہ حضرت فاطمہ کے پاس آئے (اور کسی بات پر خفا ہوکر) مسجد نبوی میں جاکر لیٹ گئے، رسول کریم تشریف لائے تو حضرت فاطمہؓ سے پوچھا تمھارے ابن عم کہاں ہیں، عرض کیا مسجد میں ہیں، آپ مسجد میں تشریف لےگئے تو دیکھا کہ حضرت علیؓ کی پیٹھ سے چادر ہٹی ہوئی ہے اور پیٹھ خاک سے بھری ہوئی ہے، آپ حضرت علیؓ کی پیٹھ سے مٹی صاف کرتے جاتے تھے اور

زندگی از دہر و دہر از زندگی است لاتسبوا الدہر فرمان نبی است[3]

روایت کے الفاظ حسب ذیل ہیں جن کی طرف شعر میں تلمیح کی گئی ہے،

عن ابی هریرة عن النبی صلی اللہ علیه وسلم قال لاتسبوا الدهر

حضرت ابوہریرہؓ کا بیان ہے کہ رسول کریم نے فرمایا کہ تم زمانے کو برا مت کہا کرو کیونکہ

[2] اسرار ص ۵۹ [3] اسرار ص ۸۲

فان الله هو الدهر	اللہ خود زمانہ ہے، (یعنی زمانے کی برائی بھلائی
مسلم ج ۲ ص ۲۳۷، علیمی)	کا مطلب خدا کی برائی بھلائی ہوگی)

حرز جاں کن گفتۂ خیر البشر ہست شیطاں از جماعت دور تر [1]

اس شعر میں اشارہ اس حدیث کی طرف ہے جس میں جماعت کی فضیلت بیان کی گئی ہے،

عن ابی ذر قال قال رسول الله	حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ
صلی الله علیه وسلم من فارق الجماعة	علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص جماعت سے بالشت بھر
شبرا فقد خلع ربقة الاسلام	بھی جدا ہوا اس نے اسلام کا پھندا اپنی گردن
من عنقه (مظاہر حق، ترجمۂ مشکوٰۃ ج ۱ ص ۸۳)	سے نکال دیا،

لا نبی بعدی ز احسان خدا است پردۂ ناموس دین مصطفیٰ است [2]

اس شعر میں اس روایت کی طرف اشارہ ہے

الا انه لا نبی بعدی (مشکوٰۃ ص ۵۳)	میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے،

بہر آں شہزادۂ خیر الملل دوش ختم المرسلین نعم الجمل [3]

اس شعر میں جس روایت کی طرف اشارہ ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں:

عن جابر قال دخلت علی النبی	حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ میں رسول کریمؐ
صلی الله علیه وسلم والحسن والحسین	کی خدمت میں ایسی حالت میں حاضر ہوا
علی ظهره وهو یقول نعم الجمل	کہ حضرات حسنینؓ آپ کی پشت مبارک پر
جملکما ونعم العدلان انتما	سوار تھے، اور آپ فرما رہے تھے کہ تمہاری
	سواری (اونٹ) بھی بہترین ہے اور تم سوار
(کنز العمال ج ۷ ص ۱۰۸، مصری)	بھی بہترین ہو،

[1] رموز بیخودی ص ۸۰ و ۱۹۴۸ء [2] ایضاً ص ۱۱۸ [3] ایضاً ص ۱۲۷

گفت با امت "ز دنیائے شما دوست دارم طاعت و طیب نسا"
(رموز ص ۱۳۰)

اس میں اس حدیث کی طرف اشارہ ہے:-

حبب الی دنیاکم النساء	مجھے دنیا کی دو چیزیں محبوب ہیں عورت اور
والطیب وجعلت قرة عینی	خوشبو اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک
فی الصلوٰة (ملا علی قاری، المصنوع	نماز ہے۔
فی احادیث الموضوع ص ۱۱ مطبع محمدی لاہور)	

جلوۂ او قدسیاں را سینہ سوز بود اندر آب و گل آدم ہنوز
(رموز ص ۱۳۰)

اس شعر میں اشارہ اس روایت کی طرف کیا گیا ہے کنت نبیا وآدم بین الماء والطین"۔ یہ روایت اگرچہ انہی الفاظ کے ساتھ مشہور اور زبان زد ہے۔ مگر حافظ سخاوی کا بیان ہے کہ ان الفاظ کے ساتھ حیثیت کسی کتاب میں نہیں ہے۔ حافظ جلال الدین سیوطی نے تو صاف طور سے اس کا رد فرما دیا ہے، لیکن اس حدیث کا مضمون بالکل صحیح ہے۔ چنانچہ ترمذی، مشکوٰۃ، خصائص کبریٰ اور کنز العمال وغیرہ میں یہ حدیث قریب قریب ان الفاظ کے ساتھ مروی ہے۔

عن ابی هریرة قال قالوا	حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ صحابہ
یا رسول الله متی وجبت	نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ آپ کو نبوت
لك النبوة قال وآدم بین	کب عطا ہوئی تھی۔ فرمایا اس وقت جب
الروح والجسد	حضرت آدم روح و جسم کی درمیانی حالت
(مشکوٰۃ ص ۵۳)	میں تھے (یعنی ان کی تخلیق بھی نہیں ہوئی تھی)

تا ز بخششہائے آں سلطان دیں مسجد ما شد ہمہ روئے زمیں
(رموز ص ۱۳۱)

مصرع ثانی میں اس حدیث کی طرف اشارہ ہے:

جعلت لی الارض مسجدا و
طهورا (بلوغ المرام ص ۱۰۵ مجتبائی)

میرے لیے تمام روئے زمین مسجد بنا دی گئی اور
پاکیزہ ٹھہرا دی گئی ہے۔

زرع انسان را پیام آخریں
حامل او رحمۃ للعالمین
(رموز ص ۱۴۰)

اس شعر کے مصرع اولیٰ کی تائید حسب ذیل حدیث سے ہوتی ہے:

ختم بی النبیون (مشکوٰۃ ص ۵۱۲)

مجھ پر نبوت ختم ہو گئی۔

فطرت مسلم سراپا شفقت است
در جہاں دست و زبانش رحمت است
(رموز ص ۱۵۲)

اس شعر کا مضمون ذیل کی حدیث سے لیا گیا ہے۔

عن عبد اللہ بن عمر عن النبی
صلی اللہ علیہ وسلم قال المسلم من
سلم المسلمون من لسانہ ویدہ
(بخاری ج ۱ ص ۶ [illegible])

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ فرمایا
رسول کریمؐ نے کہ مسلمان وہ ہے جس کی زبان
اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں۔

حرف حق از حضرت ما بردہٗ
پس چرا با دیگراں نسپردہٗ
(رموز ص ۱۹۰)

یہ شعر مندرجۂ ذیل حدیث سے ماخوذ ہے:۔

بلغوا عنی ولو آیۃ
(مشکوٰۃ ص ۳۲)

میری طرف سے (لوگوں تک) پہنچا دو خواہ ایک
آیت ہی کیوں نہ ہو۔

کارواں را رہ گذار است ایں جہاں
نقد مومن را عیار است ایں جہاں
(رموز ص ۱۰۱)

اس شعر کے مصرع اولیٰ کا مضمون ذیل کی حدیث سے ماخوذ ہے۔

عن عبد اللہ بن عمر قال اخذ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
بمنکبی فقال کن فی الدنیا کانک

حضرت عبد اللہ بن عمر نے بیان کیا کہ
رسول کریمؐ نے میرا کاندھا پکڑ کر فرمایا کہ
دنیا میں مسافر یا رہرو کی طرح

غریب او عابر سبیل (بخاری ج ۲ ص ۹۴۹)

زندگی بسر کرو۔

گفت آں مقصود حرف کن فکاں
زیر پائے امہات آمد جناں
(رموز ص ۱۶۸)

اس شعر میں اس حدیث کی طرف تلمیح کی گئی ہے:

رواہ احمد والنسائی والبیہقی
فی شعب الایمان عن معاویۃ بن
جاھمۃ ان جاھمۃ رضی اللہ عنہ
جاء الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم
فقال یا رسول اللہ اردت
ان اغزو وقد استشیرک فقال
ھل لک من ام قال نعم قال
فالزمھا فان الجنۃ عندہا
تحت رجلیھا (فتح الباری ج ۶ ص ۳۶۵)

حضرت جاہمہؓ خدمت اقدس میں حاضر ہوئے
اور عرض کیا یا رسول اللہ میرا ارادہ شرکت
جہاد کا ہے، میں آپ سے مشورہ چاہتا ہوں،
آپ نے دریافت فرمایا تمہاری والدہ
زندہ ہیں، عرض کیا جی ہاں۔ فرمایا
ان ہی کی خدمت کرو، ان کے قدموں
کے نیچے جنت ہے۔

آں امن الناس بر مولائے ما
آں کلیم اول سینائے ما
(رموز ص ۱۸۱)

اس شعر میں حضرت ابو بکر صدیقؓ کے فضائل میں جو روایت ہے اس کی طرف اشارہ ہے:۔

ان من امن الناس علی فی صحبتہ
ابو بکر ولو کنت متخذا خلیلا
لاتخذت ابا بکر خلیلا
(مشکوٰۃ ج ۴ ص ۵۵۴)

(رسول کریمؐ نے) فرمایا لوگو (جان و مال کے
اعتبار سے) مجھ پر سب سے زیادہ احسان ابو بکر نے
کیا ہے، اگر (اللہ کے علاوہ) میں کسی کو اپنا خلیل
بناتا تو ابو بکر کو بناتا

گویا ع بعد از خدا خلیل توئی قصہ مختصر

سروری در دین ما خدمت گری ست — عدل فاروقی و فقر حیدری ست
(پیام مشرق ص، طبع پنجم ۱۹۴۲ء)

اس شعر کے مصرع اولی میں اس حدیث کی طرف اشارہ ہے :-

سید القوم خادمہم — قوم کا سردار قوم کا خادم ہوتا ہے۔
(حافظ محمد بن عبد الرحمن سخاوی المقاصد الحسنہ ص ۲۱۱ طبع لکھنؤ)

صورت خاک حرم یہ سر زمیں بھی پاک ہے — آستان مسند آرائے شہ لولاک ہے[1]

"لولاک" اشارہ ذیل کی حدیث قدسی کی طرف ہے، یہ روایت سند کے لحاظ سے اگرچہ انتہائی ضعیف بلکہ موضوع ہے، پھر بھی اقبال اس کو مانتے تھے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انکو حدیث سے کتنا شغف

لولاک لما خلقت الافلاک — (اے نبی) اگر تم نہ ہوتے تو میں آسمانوں کو بھی پیدا نہ کرتا۔
(ملا علی قاری، المصنوع فی احادیث الموضوع ص ۲۲)

چنیں فرمودۂ سلطان بدر است — کہ ایماں در میان جبر و قدر است[2]

یہ الفاظ "ایمان درمیان جبر و قدر" کسی حدیث کے نہیں بلکہ فرقۂ جبریہ و قدریہ کے افراط و تفریط کے درمیانی مسلک اہل سنت کا ہے اس کو "الایمان بین القدر والجبر" سے تعبیر کیا جاتا ہے، اسی کو نظم کیا گیا ہے، اصل روایت کے الفاظ دوسرے ہیں یعنی "الایمان بین الخوف والرجاء" ایک دوسرا نظریہ بیان کیا گیا ہے۔ ممکن ہے اس شعر میں مشکوٰۃ کی ایک روایت کی طرف جس میں جبریہ و قدریہ دونوں کی تردید کی گئی ہے، اشارہ ہو، اس حدیث کے الفاظ یہ ہیں :-

قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم صنفان من امتی لیس لہما فی الاسلام نصیب المرجئۃ والقدریۃ (مشکوٰۃ ص ۲۲)

میری امت میں دو گروہ ہیں جن کا اسلام میں کوئی حصہ بھی نہیں ہے اور وہ مرجیہ اور قدریہ کے فرقے ہیں

اس کا ماحصل وہی نکلتا ہے کہ ایمان جبر و قدر کے درمیان ہے۔

منور شو ز نور "من یرانی" — مژہ برہم مزن تو خود نمانی[3]

---

[1] بانگ درا ص ۱۵۶، طبع یازدہم ۱۹۴۷ء [2] زبور عجم ص ۲۲۸ طبع چہارم ۱۹۴۸ء [3] زبور ص ۲۳۲

"من یرانی" میں اس حدیث کی طرف تلمیح کی گئی ہے :-

عن ابی قتادۃ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم من رانی فقد رای الحق (مشکوٰۃ ص ۳۹۴)

حضرت ابی قتادہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریمؐ نے فرمایا کہ جس نے مجھے (خواب میں) دیکھا اس نے فی الحقیقت مجھے دیکھا۔

از حدیث مصطفےٰ داری نصیب — دین حق اندر جہاں آمد غریب[1]

اس شعر میں جس مضمون کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس کی روایت کے الفاظ یہ ہیں :-

بدأ الاسلام غریبا وسیعود کما بدأ فطوبیٰ للغرباء (ترمذی ج ۲ ص ۹۲)

اسلام ابتدا میں جس طرح اجنبی تھا آخر میں بھی ایسا ہی اجنبی ہو جائے گا (اسکی یہ حالت غرباء سے ملتی جلتی ہے) (بشارت ہے غرباء کیلئے) [illegible]

با سیہ فاماں ید بیضا کہ داد؟ — مژدۂ لاقیصر و کسریٰ کہ داد؟[2]

اس شعر کے مصرع ثانی کے الفاظ "لاقیصر و کسریٰ" میں مندرجہ ذیل حدیث کی طرف اشارہ ہے :-

عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ھلک کسریٰ ثم لایکون کسریٰ بعدہ و قیصر لیھلکن ثم لایکون قیصر بعدہ ولتقسمن کنوزھما فی سبیل اللّٰہ (مشکوٰۃ ص ۴۶۶)

حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریمؐ نے فرمایا کہ کسریٰ (شاہ فارس) ہلاک ہو گیا اور اس کے بعد اور کوئی کسریٰ نہ ہو گا، اور قیصر (شاہ روم) عنقریب ہلاک ہو گا اور اسکے بعد پھر کوئی قیصر نہ ہو گا اور ان دونوں بادشاہوں کے خزانے خدا کی راہ میں تقسیم کر دیے جائیں گے۔

از بلا ترسی حدیث مصطفےٰ است — مرد را روز بلا روز صفا ست[3]

اس شعر میں اس حدیث کی طرف اشارہ کیا گیا ہے :-

---

[1] جاوید نامہ ص ۸۶ طبع ۱۹۴۷ء [2] جاوید نامہ ص ۸۹ [3] جاوید نامہ ص ۱۱۰

عن سعد قال سئل النبی صلی اللہ علیہ وسلم ای الناس اشد بلاءً قال الانبیاء ثم الامثل فالامثل یبتلی الرجال علی حسب دینہ فان کان دینہ صلبا اشتد بلاءہ وان کان فی دینہ رقۃ ہون علیہ فما زال کذالک حتی یمشی علی الارض ما لہ ذنب۔ رواہ الترمذی وابن ماجہ والدارمی وقال الترمذی ھذا حدیث حسن صحیح (مشکوٰۃ ص ۱۳۶)

حضرت سعدؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم سے دریافت کیا گیا کہ کون لوگ سخت آزمایش میں مبتلا ہوتے ہیں؟ آپ نے فرمایا انبیاء پھر وہ لوگ جو انبیاء سے مشابہ ہوں، انسانوں کی آزمایش ان کے دین کے مطابق کیجاتی ہے جو دین میں زیادہ سخت ہوتا ہے اسی قدر اس کی مصیبت سخت ہوتی ہے، اور جس قدر دین میں نرم ہوتا ہے اسی قدر اسکی مصیبت ہلکی ہوتی ہے، اور ہمیشہ اسی طرح ہوتا رہتا ہے یہانتک کہ وہ اس حالت میں زمین پر چلتا رہتا ہے کہ تمام گناہوں سے پاک وصاف ہوتا ہے۔ (ترمذی، ابن ماجہ دارمی) ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

گفتمش لگنبد آئین فراق ابغض الاشیاء عندی الطلاق
(جاوید نامہ ص ۱۵۹)

اس شعر میں ذیل کی حدیث کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:۔

عن ابن عمر رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابغض الحلال الی اللہ الطلاق

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک حلال چیزوں میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ طلاق ہے۔

رواہ ابوداؤد، ابن ماجہ (ابن حجر عسقلانی، بلوغ المرام ص ۲۲۴ مجتبائی)

آنکہ حرف شوق با اقوام گفت جنگ را رہبانیٔ اسلام گفت
(جاوید نامہ ص ۲۱)

اس شعر کے مصرع ثانی میں ذیل کی حدیث کی طرف اشارہ مقصود ہے:۔

ان لکل امۃ رھبانیۃ ورھبانیۃ ھذہ الامۃ الجھاد فی سبیل اللہ (کنز العمال ج ۲ ص ۲۵۸)

ہر امت کے لیے رہبانیت ہے اور اس امت کی رہبانیت جہاد فی سبیل اللہ ہے۔

آنکہ بود اللہ او را ساز و برگ فتنۂ او حب مال و ترس مرگ
(جاوید نامہ ص ۲۳۴)

اس شعر میں ذیل کی حدیث کی طرف اشارہ ہے:۔

عن ثوبان قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یوشک الامم ان تداعی علیکم کما تداعی الاکلۃ الی قصعتھا فقال قائل ومن قلۃ نحن یومئذ قال بل انتم یومئذ کثیر ولکنکم غثاء کغثاء السیل ولینزعن اللہ من صدور عدوکم المھابۃ منکم ولیقذفن فی قلوبکم الوھن قال قائل یا رسول اللہ وما الوھن قال حب الدنیا وکراھیۃ الموت۔ رواہ ابوداؤد والبیھقی (مشکوٰۃ ص ۴۵۹)

حضرت ثوبانؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مخالفوں کی جماعتیں ایک دوسرے کو تم سے لڑنے کے لیے بلائیگی جس طرح ایک کھانا کھانے والی جماعت دوسروں کو کھانے کی طرف بلاتی ہے، یہ سن کر صحابہ میں سے کسی نے پوچھا وہ لوگ ایسا اس لیے کرینگے کہ ہم اس وقت تعداد میں کم ہونگے، فرمایا نہیں، تم اس زمانے میں بڑی تعداد میں ہوگے لیکن ایسے جیسے دریا نالوں کے کنارے جھاگ ہوتے ہیں (یعنی تم نہایت کمزور اور ضعیف ہوگے) خدا تمہارا رعب اور تمہاری ہیبت دشمنوں کے دل سے نکالدیگا اور تمہارے دلوں میں ضعف اور سستی پیدا کردیگا۔ کسی نے عرض کیا یا رسول اللہ ضعف اور سستی کس وجہ سے ہوگی؟ فرمایا دنیا کی محبت اور موت سے نفرت کی وجہ سے۔

بندۂ عشق از خدا گیرد طریق
می شود بر کافر و مومن شفیق
(جاوید نامہ ص ۲۴۴)

اس شعر میں مندرجہ ذیل حدیث کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے

عن عبد اللہ بن عمرؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الراحمون یرحمھم الرحمٰن ارحموا من فی الارض یرحمکم من فی السماء (مشکوٰۃ ۴۲۳)	حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم نے فرمایا کہ جو لوگ خدا کی مخلوق پر رحم کرتے ہیں رحمٰن ان پر رحم کرتا ہے اس لیے تم زمین والوں پر رحم کرو تاکہ آسمان والا تم پر رحم کرے۔

کثرتِ نعمت گداز از دل برد
ناز می آرد نیاز از دل برد
(ایضاً)

اس شعر میں اس حدیث کی طرف اشارہ ہے:

عن عمروؓ بن عوف قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فو اللہ لا الفقر اخشیٰ علیکم ولکن اخشیٰ علیکم ان تبسط علیکم الدنیا کما بسطت علی من کان قبلکم فتنافسوھا کما تنافسوھا وتھلککم کما اھلکتھم (مشکوٰۃ ۴۴۰)	حضرت عمرو بن عوفؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم نے فرمایا کہ خدا کی قسم میں تمھارے فقر و افلاس سے نہیں ڈرتا ہوں بلکہ اس سے ڈرتا ہوں کہ دنیا تم پر کشادہ کی جائے گی جس طرح ان لوگوں پر کشادہ کی گئی جو تم سے پہلے گذر چکے ہیں، پھر تم دنیا کی رغبت کروگے (یعنی دنیا کی لذتوں میں گرفتار ہو جاؤگے) جس طرح تم سے پہلے [illegible]

ضعف ایمان است و دلگیری است غم
نوجوانا! نیمۂ پیری است غم
(ایضاً ص ۲۴۵)

"نیمۂ پیری" اشارہ اس حدیث کی طرف ہے:۔

الھم نصف الھرم (اسنی المطالب ص ۲۴۸)	فکر آدھا بڑھاپا ہے۔

می شناسی؟ حرص فقر حاضر است
من غلام آنکہ بر خود قاہر است
(جاوید نامہ ص ۲۴۵)

"فقر حاضر" سے اس حدیث کی طرف اشارہ مقصود ہے:۔

ایاکم والطمع فانہ الفقر الحاضر (سخاوی، المقاصد الحسنہ ص ۶۵)	لالچ سے بچو کیونکہ یہ ایک قسم کی کھلی ہوئی محتاجی ہے۔

کھو یا گیا جو مطلب ہفتاد و دو ملت میں
سمجھے گا نہ تو جب تک بے رنگ نہ ہو ادراک
(بال جبریل ص ۲۶ طبع دوم ۱۹۴۱ء)

اس شعر کے مصرع اولیٰ میں حسب ذیل حدیث کے ٹکڑے کی طرف اشارہ ہے:۔

وتفترق امتی علی ثلاث وسبعین ملۃ کلھم فی النار الا ملۃ واحدۃ (ترمذی ج ۲ ص ۹۳ مجتبائی)	(رسول کریم نے فرمایا کہ) میری امت میں تہتر فرقے ہونگے جن میں سوائے ایک فرقے کے سب جہنم میں جائیں گے۔

بندۂ حق وارثِ پیغمبراں
او نگنجد در جہانِ دیگراں
(مسافر ص، طبع سوم ۱۹۴۷ء)

اس شعر کے پہلے مصرع میں حدیث ذیل کی طرف اشارہ ہے:۔

العلماء ورثۃ الانبیاء (اسنی المطالب ص ۱۴۴)	علماء انبیاء کے وارث ہیں۔

آہ یورپ زیں مقام آگاہ نیست
چشم او ینظر بنور اللہ نیست
(پس چہ باید کرد ص ۳۳ طبع سوم ۱۹۴۷ء)

اس شعر کے دوسرے مصرع میں اس حدیث کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:۔

اتقوا فراسۃ المومن فانہ ینظر بنور اللہ (اسنی المطالب ص ۲۳۸)	مومن کی فراست سے ڈرو کیونکہ وہ اللہ کے نور کے ذریعے دیکھتا ہے۔

آب و گل تیری حرارت سے جہانِ سوز و ساز
ابلۂ جنت تری تعلیم سے دانائے کار
(ارمغان حجاز ص ۲۰۰ طبع سوم ۱۹۴۸ء)

"ابلۂ جنت" یہ ترکیب مندرجۂ ذیل حدیث سے ماخوذ ہے:۔

اکثر اھل الجنۃ البلہ (اسنی المطالب ص ۴۴)	اکثر جنتی بھولے بھالے ہوتے ہیں۔

اس حدیث کو بیہقی نے شعب الایمان میں اور محدث بزار نے اپنی المسند میں روایت کیا ہے، بعض اور محدثوں کے یہاں بھی یہ روایت ملتی ہے، علامہ ابن الاثیر اپنی کتاب تمیز الطیب من الخبیث (ص ۳۲ طبع مصر) میں لکھا ہے کہ اس کی سند کمزور ہے

مقصد لحمک لحمی پہ کھلی ان کی زباں	یہ تو اک راہ سے تجھ کو بھی برا کہتے ہیں (باقیات اقبال ص ۳۵ طبع اول ۱۹۵۲ء)

"لحمک لحمی" میں اس ضعیف حدیث کی طرف اشارہ ہے :-

ان علیا لحمہ من لحمی ودمہ من دمی	علی کا گوشت میرا گوشت پوست ہے اور انکا
(کنز العمال ج ۶ ص ۱۵۴)	خون میرا خون ہے

سخنے رانده کہ جز قرشی	بر سر مسند نبی ننشست (باقیات ص ۱۲۷)

اس شعر میں اس حدیث کی طرف اشارہ مقصود ہے :-

الائمۃ من قریش (فتح الباری ج ۶ ص ۵۲۹)	امام قریش میں سے ہوں گے
مجھکو انکار نہیں آمد مہدی سے مگر	غیر ممکن ہے کوئی مثل ہو پیدا تیرا (رخت سفر ص ۷۶ نقش اول ۱۹۵۲ء)

مصرع اولیٰ میں مندرجۂ ذیل حدیث کی طرف اشارہ مقصود ہے :

المہدی من عترتی من ولد فاطمہ	مہدی میری نسل اور فاطمہ کی اولاد
(ابو داؤد ص ۵۸۸ مطبوعہ اصح المطابع کراچی)	سے ہوں گے۔

اقبال کے کلام سے احادیث رسول کے جو نمونے اوپر نقل ہوئے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ اقبال کو قول نبوی سے کس درجہ مناسبت تھی، جہاں تک ممکن ہوا وہ تمام اشعار پیش کر دیے گئے ہیں جن میں کسی نہ کسی نوع کا اشارہ حدیث نبوی کے متعلق پایا جاتا ہے، یہاں یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ اقبال نے جن احادیث کو اپنے کلام میں شامل کیا ہے ان میں کسی نہ کسی اسلامی قدر کو اجاگر کیا گیا ہے، گویا ایک طور پر اقبال نے احادیث رسول کی روشنی میں اسلامی اقدار کے احیا کی کامیاب کوشش کی ہے۔

تلخیص و تبصرہ

ہنگری کے مستشرقین

اور

ان کے علمی کارنامے

از جناب مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری اڈیٹر البلاغ بمبئی

ذیل کے مقالہ سے جہاں یہ معلوم ہوگا کہ ہنگری کے مستشرقین کہاں تک مشرقی علوم و فنون اور اسلامیات سے دلچسپی رکھتے ہیں اور انھوں نے اس سلسلہ میں کیا کیا علمی کارنامے انجام دیے ہیں، وہاں یہ بھی معلوم ہوگا کہ دنیا کی قوموں میں کس طرح آبائی وطن اور وہاں کی آب و ہوا کے اثرات نسلاً بعد نسلٍ ہزارہا سال تک علم و فکر پر چھائے رہتے ہیں اور انقلاب و تغیر کے ساتھ ساتھ وطن و نسل کی خوبو چلتی رہتی ہے،

ہنگری وسط یورپ میں چیکوسلاویہ، آسٹریا، یوگوسلاویہ، رومانیہ اور سوویٹ یونین کے مابین ایک آزاد ریاست ہے، جس کا رقبہ ۹۳،۰۳۰ کیلو میٹر، اور آبادی ۱۰،۰۰۰،۰۰۰ کے لگ بھگ ہے، اس کا دارالسلطنت بوداپسٹ ہے جس کی آبادی ۱،۹۳۰،۰۰۰ ہے، یہ بہت بڑا تجارتی اور صنعتی مرکز ہے، پہلے اس کا دارالسلطنت صرف بودا نامی شہر تھا، مگر جب ۱۹۷۳ء میں ترکی کے سلطان سلیمان قانونی نے ہنگری پر قبضہ کیا تو پست نامی شہر کو بھی بودا کے ساتھ ملا دیا،

اس وقت سے بوداپسٹ ایک شہر بن کر دار السلطنت بن گیا، ان دونوں شہروں کے درمیان دریائے ڈینوب (DANUDE) بہتا ہے، ہنگری سرسبز و شاداب اور زراعتی ملک ہے، صنعت و حرفت کے اعتبار سے بھی یہ ملک یورپ کے دوسرے ملکوں سے پیچھے نہیں ہے۔

ہنگری کے باشندوں کا مشرقی ممالک اور مشرقی علوم سے قدیم تعلق

ہنگری کو عرب مورخ و جغرافیہ نویس عام طور سے مجر کہتے ہیں اور یہاں کی زبان کو مجری کے نام سے یاد کرتے ہیں، یہاں کے باشندے نسلاً مشرقی ہیں، قدیم زمانہ میں ان کا مسکن ایران تھا اور شاہان ایران کے دور میں یہ لوگ بہت مہذب و متمدن تھے، بعد میں یہ مغربی ترکستان کی طرف گئے اور ان کا تعلق ترکوں سے ہو گیا جس کی بنا پر ترک کہلائے، ترکی حدود میں آنے کے بعد اس قوم کی شان و شوکت بہت بڑھ گئی، اس وقت اس علاقہ کے لوگوں نے اس کے خلاف اقدام کیا، جس کے نتیجہ میں اس قوم کا ایک حصہ یورپ چلا گیا اور ایک حصہ مشرقی ایشیا کی طرف پسپا ہو گیا۔ جو لوگ یورپ چلے گئے انھوں نے ہنگری کو اپنا مسکن بنایا اور ان میں سے اکثر نے نصرانی مذہب قبول کر کے ایک شاندار حکومت قائم کی، چونکہ یہ لوگ نسلاً و اصلاً مشرقی تھے اس لئے مغرب میں آباد ہو جانے اور ان پر اپنی حکومت قائم کرنے کے باوجود ان کو اپنے قدیم مشرقی علوم و فنون سے تعلق باقی رہا اور وہ اس کی تلاش و جستجو میں رہا کئے، سولھویں صدی میں ہنگری پر سلاطین ترکی کے قبضہ کے بعد خصوصاً اٹھارہویں صدی میں ان لوگوں میں اپنے قدیم علوم و فنون کی تلاش زیادہ بڑھ گئی۔

جیسا کہ معلوم ہوا ہنگری میں آباد ہو جانے کے بعد اکثریت کا مذہب تو عیسائیت ہو گیا لیکن جو لوگ اسلام سے وابستہ رہے، ان کو مجری مورخ اسماعیلی بتاتے ہیں، یہ لوگ عام طور سے تجارت اور صرافہ کا کاروبار کرتے تھے، اور تیرھویں صدی تک اپنی اولاد کو حلب کے حنفی مدارس میں دینی اور فقہی تعلیم کے لئے بھیجتے تھے، حروب صلیبیہ کے پانچویں حملہ (۱۲۱۹ء تا ۱۲۲۱ء) جنگی اخراجات کے لئے مسیحی بادشاہ اندریا ثانی نے ان مجری مسلمانوں کو سکہ ڈھالنے کا حکم دیا تو انھوں نے اسلامی انداز پر سکہ تیار کیا جس پر

"لا الہ الا اللہ" لکھا تھا

ایک زمانہ میں یورپ کو عثمانیوں سے سخت خطرہ لاحق ہوا اور ان سے جنگ کرنے کے لیے ہنگری کے بادشاہ سفسمند کی قیادت میں ہنگری، بولونیا، فرانس اور جرمنی کے جوانوں کی فوج تیار کی گئی، جسے سلطان بازید عثمانی نے ۱۳۹۶ء میں نیغوپولیس کی جنگ میں مغلوب کیا، اس کے بعد ۱۵۲۶ء میں عثمانیوں نے واقعۂ موہاچ میں ہنگری کی فوج کو شکست دی اور ۱۵۴۱ء میں اس کے دار السلطنت پر قبضہ کر لیا، تو وہاں کا حکمراں خاندان دانوب کے مغرب میں پناہ گزیں ہو گیا، اس واقعہ کے بعد ہنگری کے باشندے عام طور سے سلاطین عثمانیہ کے طرفدار بن گئے، اور ترانسلوانیا کی حکومت نے عثمانیوں سے معاہدہ کر لیا، یہاں تک کہ عثمانیوں اور ہنگری کے مغلوب حکمراں خاندان کے مابین جنگ ہوئی جس کے نتیجہ میں بڑی تباہی آئی۔

ان تمام ادوار میں مجریوں (ہنگری والوں) نے اپنے نسلی ورثہ کو محفوظ رکھنے کی کوشش جاری رکھی اور جنگ و پیکار کے زمانہ میں بھی وہ اپنے آبائی علوم و فنون سے غافل نہیں ہوئے، ان کے گرجاؤں میں مشرقی علوم کے نادر مخطوطات محفوظ رہے، خاص طور سے باکونی بیل (Bakony Bel) کا گرجا ان کا ثقافتی و علمی مرکز رہا، جہاں ان کے لاتینی مخطوطات نوے جلدوں میں موجود تھے، نیز مجریوں نے ان ایام میں مشرقی غنا، عروض اور قصص و روایات کو مجری ادب میں منتقل کیا، اس زمانہ میں مشرقی علوم سے زیادہ متاثر ہونے والوں میں بالینٹ بالاشہ صف اول کا عالم تھا،

عثمانی سلاطین نے مجر پر ڈیڑھ سو سال تک حکومت کی اور بودا کے ساتھ پسٹ کو بھی اس کا دار السلطنت بنایا، چنانچہ ۱۸۷۳ء سے آج تک بوداپسٹ ہنگری کا دار السلطنت ہے، اس درمیان میں مجریوں نے خاص طور سے اپنے آبائی ذہن و فکر والوں کی حکمرانی سے فائدہ اٹھا کر ترکی اور عربی زبانیں سیکھیں، اور ترکی حکومت میں کام کیا، اس وقت سے مجریوں میں استشراق اور مشرقی علوم

سے نیا ذوق و شوق پیدا ہوں اور ترکی حکومت کے سرکاری آفسوں کے کارندوں اور منشیوں میں مستشرقین پیدا ہونے شروع ہوگئے، ان ہی میں یفن روشنیای نامی ایک سرکاری عہدہ دار نے مجری زبان میں کلیلہ و دمنہ کا ترجمہ کیا، ہنگری پر ترکی حکومت کی خیر و برکت کا یہ پہلا علمی و فکری ظہور تھا، جو اس زمانہ میں اس ترجمہ کی شکل میں ظاہر ہوا، ترکی حکومت کا یہ علمی و فکری پودا ہنگری کے اہل علم میں بڑھتا رہا اور مشرقیات سے دلچسپی لینے والوں کی تعداد زیادہ ہوتی رہی، یہانتک کہ وہاں آزادی کی لہر آئی اور ساتھ ہی عام طور سے دنیا میں استشراق کا ذوق پیدا ہوا جس سے وہاں کے باشندوں میں علم و تحقیق کا ذوق بڑھا، چنانچہ وہاں کے طلبہ ہالینڈ، جرمنی، آسٹریا کی یونیورسٹیوں میں مشرقی زبانوں کی خاص طور سے عبرانی زبان کی تعلیم کے لیے جانے لگے، ان میں مذہبی طلبہ بھی تھے جنھوں نے ترکی اور عربی کو اپنا موضوع قرار دیا اور وہ ان زبانوں میں اس طرح کامیاب ہوئے کہ ان کی تعداد کم ہونے کے باوجود ان کو عالمی شہرت ملی،

مشرقی علوم کے مراکز درسگاہیں اور مجلات

ہنگری میں مشرقی علوم و فنون کے کئی مرکز ہیں، جن میں ٹرانسلوانیا کا پروٹسٹنٹ کالج بوداپسٹ یونیورسٹی اور اس کے معہد مشرقی، معہد وسط ایشیا اور معہد یہودی جن میں سامی زبانوں کی بھی تعلیم ہوتی ہے، بہت مشہور مرکز ہیں، مشرقی علوم کے کتب خانوں میں ہنگری کی علمی اکیڈمی کی لائبریری بہت مشہور ہے، اسی طرح وہاں پر مشرقیات کے میوزیم اور عجائب خانے بھی ہیں، ایشائی فن کا میوزیم، جسے بوداپسٹ میں ۱۹۱۹ء میں فرنسیس ہوپ (Fr Hopp) نے قائم کیا تھا، اس کا پہلا محافظ و نگران ذلطان طاقاج (Z. Takacs) تھا، اس نے اس کی ترتیب دی اور اس کی فہرست تیار کی، یہ فاضل آجتک بوداپسٹ یونیورسٹی میں ہندی چینی اور جاپانی فنون کا استاذ ہے، اس کی پیدائش ۱۸۸۱ء میں ہوئی،

نیز اس میوزیم سے اروِن بقطای (E. Baktay) کا خصوصی تعلق ہے، یہ فاضل

ہندی فن اور ہندوستان کی زبانوں کا متخصص ہے، اس کی پیدائش ۱۸۹۰ء میں ہوئی،

اس میوزیم کے موجودہ نگران ڈاکٹر ٹیبور حوروات (T. Horvath) ہیں جنھوں نے کئی سال جاپان میں گذارے ہیں اور ایشائی فن پر انگریزی میں ایک نہایت عمدہ کتاب لکھی ہے،

مشرقیات پر بحث کرنے والے مجلات و رسائل میں (۱) مجلہ شرقیہ کلتی سملہ (Revue-orientale) (۲) کوروشی گوما (Revuekorosigsom) (۳) اور مجری زبان کا سالنامہ (Acta orientalia) جو ہنگری کی علمی اکیڈمی کی طرف سے شائع ہوتا ہے، یہ رسالے مستشرقین کے مباحث کو شائع کرتے ہیں اور انکا خصوصی موضوع استشراق ہے۔

ہنگری کے قدیم و جدید مستشرقین

(۱) کاؤنٹ کاروی ریویتسکی (Cta. Reviczky. K.) (۱۷۷۶ء، ۱۷۹۳ء)۔ اس نے وائنا کی درسگاہ میں تعلیم پائی جسے ملکہ ماریہ تریزہ نے مشرقی ممالک میں اپنے سفرا اور مندوبین کی تعلیم کے لیے قائم کیا تھا، کاروی کو آسٹریا کے بادشاہ نے فارسوویہ میں اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا تھا، پھر لندن بھیجا جہاں کاروی اور سر ولیم جونس کے درمیانی تعلقات نہایت خوشگوار ہوگئے سر ولیم جونس بہت مشہور انگریز مستشرق تھا، کاروی نے ۱۷۷۱ء میں حافظ شیرازی کے فارسی دیوان کا لاطینی ترجمہ شائع کیا، بعد میں اسی ترجمہ کو بنیاد قرار دیکر ۱۷۷۴ء میں انگریز مستشرق ریتشادسون نے دیوان حافظ کا ترجمہ کیا، نیز کاروی کے ترجمہ کی بنیاد پر ۱۷۸۲ء میں فریڈل نے اس کا ترجمہ جرمنی زبان میں شائع کیا،

(۲) یانوش اوری (Uri, Y.) (۱۷۲۴ء، ۱۷۹۶ء)۔ یہ ناگو کوروش میں پیدا ہوا، ۱۷۵۳ء میں ہالینڈ کی ہاڈرویک یونیورسٹی سے فراغت حاصل کی اور اپنے دور میں مشرقی علوم میں سب سے آگے گیا، ۱۷۵۶ء سے ۱۷۶۰ء تک لیڈن میں مقیم رہا، اور اسی جگہ سے ۱۷۶۱ء میں امام بوصیری کا قصیدہ بردہ شائع کیا، یورپ میں اس قصیدہ کو نہایت زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی،

اور دس سال بعد ۱۷۷۱ء میں اس کا دوسرا اڈیشن شائع کرنا پڑا، نیز اوری نے قصیدہ بُستی کا لاطینی
ترجمہ شائع کیا، ۱۷۷۰ء میں اس کا تعلق آکسفورڈ یونیورسٹی سے ہوگیا، جہاں اس نے ۱۷۸۷ء میں
کتب خانہ بودلیہ کے مشرقی مخطوطات کی فہرست مرتب کی، اس کتب خانہ میں عربی، عبرانی، کلدانی، سریانی
قبطی، ترکی اور فارسی زبانوں کے مخطوطات تھے، بعد میں اس فہرست کی تکمیل نیکول اور بو اڈی نے کی،
نیز اوری آکسفورڈ یونیورسٹی میں مشرقی زبانوں کا لکچرار مقرر کیا گیا، اس کی علمی عظمت کا یہ حال تھا کہ
جب وہ مرا تو قدیس میشیل کے جوار میں دفن کیا گیا۔

(۳) شاندور کوارش گوما (۱۷۸۴ء، ۱۸۴۲ء) (Csoma, S. K.) اس نے پروٹسٹنٹ
کالج میں عربی، ترکی، فارسی اور عبرانی کی زبانوں کی تعلیم حاصل کی اور انکی تکمیل انجورن سے کی، اسنے مجریوں
کے قدیم اور اصل مسکن کی تحقیق و تلاش میں پیدل سفر شروع کیا، ترکی، ایران اور افغانستان ہوتا ہوا تبت
پہنچا، جہاں سات سال رہ کر ایک بودھی درسگاہ میں تبتی زبان سیکھی اور ۱۸۳۴ء میں انگریزی زبان میں
تبتی زبان کی نہایت مستند لغت تیار کی، جو بعد میں تبتی زبان کے لیے مرجع بنی، تبت کے بعد ایشیاٹک
سوسائٹی کلکتہ میں مدتوں مقیم رہا، ۱۸۴۲ء میں پھر تبت کے سفر کے ارادہ سے نکلا، مگر راستہ میں موت
واقع ہوگئی اور دارجلنگ میں انگریزوں کے قبرستان میں دفن ہوا۔

(۴) جارج کاتبورسکی (پیدائش ۱۸۱۹ء) (Kanyurszky, G.) اس نے
وانا یونیورسٹی میں تعلیم پائی، اور وہیں سے ۱۸۸۳ء میں عربی نحو کا مشہور متن اجرومیہ مجری زبان میں
شرح کے ساتھ شائع کیا۔

(۵) کوفمان (۱۸۵۲ء، ۱۸۹۹ء) (Kaufmann, D.) برسلاؤ یونیورسٹی
میں تعلیم حاصل کی، اور بوداپسٹ کے معہد علمی یہودی میں مدرس بنایا گیا، کوفمان نے اپنا قیمتی کتب خانہ علمی
اکیڈمی مجریہ پر وقف کیا، اس نے بوداپسٹ سے ۱۸۹۹ء میں سلمون بن جبرول کے علمی و تحقیقی کارناموں

شائع کیا، اور خود جو علمی اور تحقیقی کارنامے چھوڑے جن کی اشاعت بعد میں فرانکفورٹ سے ۱۹۱۱ء
میں تین جلدوں میں کی گئی،

(۶) کانٹ غیزا قون (۱۸۳۶ء، ۱۹۰۵ء) (CTE. Kuun, G.)
غوتنغن یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی اور مجر کی قدیم تاریخ کے عربی اور فارسی ماخذ و مصادر کا خصوصیت
سے پتہ چلایا، طبی تصنیفات و کتب پر ایک جامع کتاب لکھی، نیز ترکوں کے ادب و لغت پر متعدد مقالات لکھے،

(۷) ویجیف توری (۱۸۶۱ء، ۱۹۰۰ء) (Thury, J.) بوداپسٹ اور
اور لیپزگ یونیورسٹیوں سے فراغت حاصل کی، اور وسط ایشیا کی زبانوں اور ترکی لب ولہجہ پر
وامبیری کے طرز پر کتاب لکھی،

(۸) ولہلم باخر (۱۸۵۰ء، ۱۹۱۳ء) (Bacher, W.) بران یونیورسٹی
میں تعلیم حاصل کی، اور بوداپسٹ یونیورسٹی اور اس سے متعلق معہد علمی یہودی میں سامی زبانوں کے استاد
کی حیثیت سے مقرر کیا گیا، باخر نے لیپزگ سے ۱۹۰۵ء اور ۱۹۱۴ء کی درمیانی مدت میں موسیٰ
ابن میمون پر ایک کتاب دو جلدوں میں شائع کی، اور ۱۹۰۹ء میں "سامی زبانوں کے تاریخی ادوار"
کے نام سے کتاب لکھی، نیز اس نے "تاریخ یمن" اور "بلاد عرب میں یہودی مستعمرات" نامی کتابیں لکھیں،

(۹) آمن وامبیری (۱۸۳۲ء، ۱۹۱۳ء) (Yambery. A)
اس نے بغیر استاد کے مشرقی زبانیں سیکھیں، ایک زمانہ تک ترکی میں رہ کر مجریوں کے اصلی مسکن کے آثار
و علوقات پر بحث کی، پھر درویشانہ صورت اختیار کر کے ایران کے شہروں سے خیوا تک سفر کیا
نیز سمرقند اور بخارا گیا، واپسی پر بوداپسٹ یونیورسٹی کے معہد علمی میں ترکی اور فارسی زبانوں کا
پروفیسر مقرر کیا گیا اور ایسی کتابیں لکھیں جن سے وسط ایشیا کی قدیم زبانوں پر نئی روشنی پڑتی ہے،

(۱۰) کموشکو پادری (۱۸۷۶ء، ۱۹۱۳ء) (Kmosko, M.) مشہور مستشرق

غولڈصیہر سے بوداپسٹ کے معہد میں حاصل کی اور استاذ کے بعد ان کی جگہ سنبھالی، کموشکو نے فصوص سریانیہ کے نام سے ایک کتاب لکھی جو اپنے موضوع پر نہایت قیمتی کتاب ہے اور اسکی کئی شرحیں ہیں۔

(۱۱) ہیٹر ہاٹالا (م ۱۹۱۵ء) (Hatala, P.) لیبزیگ یونیورسٹی میں تعلیم پائی اور مشرقی ممالک کا علمی سفر کیا، واپسی پر سامی زبانوں کے پروفیسر کی حیثیت سے تقرر ہوا، ہاٹالا نے ۱۸۷۷ء میں عربی نحو کا مشہور متن اجرومیہ اپنے اہتمام سے شائع کیا اور اس کے ساتھ سامی زبانوں کی باریکیوں کے مباحث بھی شامل کیے،

(۱۲) سالمون اسٹرن (پیدائش ۱۸۶۷ء) (Ozztern, S.) بوداپسٹ یونیورسٹی میں تعلیم پائی، اسلامی تاریخ اور اسلامی فقہ کے مباحث میں خصوصی شہرت پائی، اسلامی تاریخ کے اجتماعی نظریات پر بہت کچھ لکھا، اسٹرن نے مجری زبان کے علاوہ کئی اجنبی زبانوں میں کتابیں لکھیں، قرآن حکیم میں اخلاق کی آواز، اور قرآن حکیم میں جہاد اور شریعت کی ادائیگی کے موضوعات پر کتابیں اور مقالات لکھے،

(۱۳) غولڈصیہر (۱۸۵۰ء، ۱۹۲۱ء) (Goldzier, G.) بوداپسٹ لیبزیگ اور برلن کی یونیورسٹیوں میں ان کے بڑے بڑے اساتذہ سے سامی زبانیں حاصل کیں، جب انکی علمی شہرت زیادہ ہوئی تو ۱۸۷۳ء میں ہنگری کی حکومت نے شام کے سفر کی دعوت دی، شام میں ایک زمانہ تک شیخ طاہر جزائریؒ[1] سے علمی تعلقات رہے، پھر وہاں سے فلسطین اور پھر مصر

[1] شیخ طاہر جزائریؒ (۱۸۵۱ء، ۱۹۲۰ء) دمشق میں ۱۲۶۸ھ میں پیدا ہوئے، ان کے والد شیخ محمد صالح سمعونی جزائری مالکی مسلک کے زبردست عالم و فقیہ تھے، الجزائر سے ہجرت کرکے دمشق آئے اور مالکیہ کے مفتی بنے۔ شیخ طاہر جزائری نے شیخ عبدالرحمن بوشناقی اور شیخ عبدالغنی میدانی وغیرہ سے پڑھا، دینی علوم کے ساتھ لغت و ادب پر شغف تھا، سات سال کی عمر سے قلمی کتابوں کے پڑھنے اور جمع کرنے کا شوق تھا، ۱۲۹۵ھ میں

(باقی ص ۷۱ پر)

جانا ہوا، مصر میں غولڈصیہر نے جامع ازہر کے اساتذہ و شیوخ سے خصوصاً شیخ محمد عبدہؒ سے خوب استفادہ کیا اور سامی لغات کے اصول پر بیش بہا معلومات حاصل کیں، نیز اسلامی تاریخ، مسلمانوں کے علوم و فنون اور ان کی فکری حرکات پر بے نظیر تحقیقات کیں جس کی وجہ سے غولڈصیہر کا مشاہیر مستشرقین میں شمار ہونے لگا، اور بڑے بڑے مستشرقین نے ان کی عظمت کا لوہا مانا اور وسعت علمی کے ساتھ ان کی بے تعصبی کا اقرار کیا، غولڈصیہر بوداپسٹ یونیورسٹی میں سامی زبانوں کے پروفیسر بنائے گئے، اور بہت سی علمی اکیڈمیوں کے ممبر چنے گئے، چنانچہ مجمع علمی دمشق اور مجمع لغوی قاہرہ کے ممبر رہے، ایڈن اور کیمبرج کی یونیورسٹیوں نے ان کو ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری دی، ۱۸۸۳ء میں لندن کی مستشرقین کانفرنس میں امام داؤد ظاہری کے مذہب پر علمی اور تحقیقی مقالہ پیش کیا، امام داؤد ظاہری اور

[1] (بقیہ حاشیہ ص ۷۰) مدحت پاشا کی گورنری کے زمانہ میں شام کے ابتدائی مدارس کے مفتش بنائے گئے، ۱۳۲۵ھ میں مصر چلے گئے اور وہیں سے حج و زیارت سے مشرف ہوئے، اور پیرس میں مستشرقین کی کانفرنس میں شرکت کی، ۱۳۳۸ھ میں دمشق واپس آئے تو المجمع العلمی کے رکن اور دار الکتب الظاہریہ کے مدیر بنائے گئے، اس کتب خانہ کو آپ نے اپنے چند ہم ذوق کی مدد سے قائم کیا تھا، مگر مصر چلے جانے کی وجہ سے اس سے تعلق باقی نہیں رہا تھا، طاہر جزائری عربی فارسی اور ترکی زبانوں کے عالم تھے، ساتھ ہی فرانسیسی، سریانی، حبشی اور زواوی زبانوں سے تھوڑے بہت واقف تھے، ۱۳۳۹ھ میں فوت ہوئے،

بیسیوں کتابیں لکھیں جن میں الجواہر الکلامیہ فی العقائد الاسلامیہ، قصص الانبیاء، تسہیل المجاز الی فن المعنی والالغاز، ارشاد الالباء الی طریق تعلیم الف باء، توجیہ النظر الی علم الاثر، التبیان لبعض مباحث القرآن، التقریب الی اصول التعریب وغیرہ زیادہ مشہور ہیں، مشہور سامی ادیب و محقق علامہ محمد کرد علی نے شیخ طاہر جزائری کی شاگردی سے بڑا فیض پایا تھا، وہ ان کو ائمۂ اصلاح میں شمار کرتے تھے اور شیخ المصلحین کہا کرتے تھے۔

امام ابن حزم کی کتابیں جمع کی تھیں، اور ابن حزم کی کتاب الابطال کا ایک حصہ شائع بھی کیا تھا، ۱۹۰۲ء میں ہمبرگ کی مستشرقین کانفرنس میں "عربوں کے نزدیک علم المرایا" پر ایک تحقیقی مقالہ پیش کیا، نیز اسلام سے متعلق بہت سے علمی مقالات ایشیا اور یورپ کے جرمنی، فرانسیسی، انگریزی، روسی، مجری اور عربی زبانوں کے جرائد و مجلات میں شائع کیے، غولڈصیہر نے اپنی مشہور کتابیں جرمنی، فرانسیسی، اور انگریزی زبانوں میں لکھیں، ان کے ذاتی کتب خانہ میں چھ ہزار ایسی کتابیں تھیں جن کا تعلق فقہ، فلسفہ، فنون، لغت اور ادب سے تھا، ان کتابوں پر غولڈصیہر نے نہایت قیمتی حواشی، استدراکات اور تحقیقات درج کی تھیں، ان کے علاوہ ہزاروں علمی و تحقیقی مجلات و کتب تھیں، جن کو دنیا کے مستشرقین نے ہدیہ میں پیش کر کے ان کے علم و فضل کا اعتراف کیا تھا، ان کے مرنے کے بعد اس کتبخانہ کو ان کے خاندان نے قدس کے مکتبہ عربیہ کو فروخت کر دیا، اس طرح غولڈصیہر کا یہ کتب خانہ اس کے لیے بنیاد بنا،

استاد غولڈصیہر نے مختلف موضوعات پر علمی اور تحقیقی آثار و متروکات چھوڑے اور اسلام، اسلامی فقہ اور عربی ادب پر فرانسیسی، جرمنی اور انگریزی زبانوں میں کتابیں لکھیں، یہود انگریزی میں لیپزگ ۱۸۷۰ء) شیعہ کے اداب جدل جرمنی میں (لیپزگ ۱۸۷۴ء) یہود کے اساطیر (لیپزگ ۱۸۷۶ء) ۱۸۷۷ء میں اس کتاب کا انگریزی میں ترجمہ کیا، اسلام جرمن زبان میں (بوداپست ۱۸۸۱ء، نیز ہیڈبرگ ۱۹۱۰ء) آج تک مستشرقین میں کسی نے اس موضوع پر ایسی کتاب نہیں لکھی، غولڈصیہر کی نگرانی میں اوران نے اس کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں اسلام میں عقیدہ و شریعت کے نام سے کیا، (پیرس ۱۹۲۰ء) اس کے بعد عربی میں اس کا ترجمہ ہوا، درس اسلام دو ضخیم جلدوں میں لکھی، (ہالہ ۱۸۸۵ء و ۱۸۹۰ء) فقہ اسلامی پر فلسفیانہ بحث جرمنی زبان میں دو جلدوں میں (۱۸۸۹ء) مشہور عربی شاعر حطیہ کا دیوان عربی متن اور ترجمہ و تعلیق کے ساتھ شائع کیا (لیپزگ ۱۸۹۳ء)، نیز غولڈصیہر نے

اپنے دوست شیخ طاہر جزائری کی کتاب توجیہ النظر فی علم الاثر کو جرمن زبان میں منتقل کیا، اسی طرح سجستانی کی کتاب المعمرین کا ترجمہ کیا (لیڈن ۱۸۹۹ء) مرجیہ کے نزدیک عقائد و شرائع اور قدریہ و معتزلہ نامی کتابیں ۱۸۹۶ء میں شائع کیں، امام غزالی کی کتاب المستظہرین فی فضائح الباطنیۃ و فضائل المستظہریہ کے ایک بڑے حصہ کو ۱۰۰ صفحے کے مقدمہ کے ساتھ شائع کیا (لیڈن ۱۹۱۶ء) پھر اس کتاب کے بارے میں ۱۱۲ صفحات کی ایک بحث لکھی،

نیز غولڈصیہر نے کئی قیمتی مقالات لکھے، ایک مقالہ میں اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنی کے بارے میں اسرائیلی تصریحات پر بحث کی، (لیپزگ ۱۸۹۳ء) اسی طرح ایک مقالہ میں اسلام میں تقیہ کے موضوع پر بحث کی، فرانسیسی زبان میں سامری اور اس کے سونے کے بچھڑے پر ایک رسالہ لکھا اور حسین بن منصور حلاج پر ایک رسالہ لکھا جس میں کتاب الطواسین پر اچھوتے انداز میں بحث کی، یہ رسالہ ۱۹۱۳ء میں شائع ہوا،

(۱۴) [illegible]ناندور کیجل (۱۸۶۲ء، ۱۹۳۰ء) (Kegel, S) بوداپست کے معہد میں استاد غولڈصیہر سے تعلیم حاصل کی اور ادب فارسی کے نوادر و عجائب میں تخصص کیا، کیجل کے علمی کارناموں میں جدید ادب فارسی (بوداپست ۱۸۹۲ء) جلال الدین رومی، فارسی کی قومی شعر و شاعری (۱۸۹۹ء) اور امیر خسرو اور انکے اشعار (بوداپست ۱۹۱۱ء) کتابیں ہیں،

(۱۵) برنارڈ مونقاجی (۱۸۶۰ء، ۱۹۳۷ء) (Munkacsi, B) بوداپست یونیورسٹی میں مشرقی زبان کی تعلیم حاصل کی، پھر ہنگری کی علمی اکیڈمی کے مجلہ شرقیہ کے مدیر تحریر ہوئے، اور اس میں فلینڈ کی زبان کا تعلق ترکی اور تاتاری مصطلحات سے" کے موضوع پر نہایت کامیاب بحثیں لکھیں، اور مجری زبان میں قوقازی زبان کے مفردات کو جمع کیا،

(۱۶) اوریل شٹین (۱۸۶۲ء، ۱۹۴۳ء) (Stein, Au, M) یہ شخص وسط ایشیا

چین، ایران اور عراق کے آثار کا سب سے بڑا عالم مانا جاتا ہے، اور اسکی کتابیں ابتک نئی دہلی کے میوزیم میں محفوظ

(۱۷) ہلیر (۱۸۷۳ء تا ۱۹۴۵ء) (Heller, B) بوداپسٹ یونیورسٹی میں تعلیم پائی اور اسلام
اور یہودی علوم کو اپنا موضوع بنایا، اس نے غولدصیہر کے ان باقی ماندہ علمی کارناموں کو شائع کیا جنکا تعلق
اسلام اور یہودیت کے مباحث سے تھا، اور وہ ابتک شائع نہ ہو سکے تھے، اسکا مقدمہ ماسینیون نے لکھا،
یہ کتاب مجری، جرمنی، فرانسیسی، انگریزی، روسی، سویدی اور عربی زبانوں میں چھپی،

(۱۸) ولیموس پروہلی (۱۸۷۱ء تا ۱۹۴۶ء) (Prohle, V.) اس نے ترکی، فارسی،
عراقی اور عربی زبانوں کو حاصل کیا، اور ۱۹۲۳ء تک ڈیبرین یونیورسٹی میں پروفیسر رہا، پھر بوداپسٹ
یونیورسٹی میں آگیا، اسکی کتابوں تاریخ ادب عثمانی اور تاریخ ادب جاپانی زیادہ مشہور ہیں نیز اس نے ترکی زبان کے قواعد لکھے
جس میں قوقازی ترکی لہجوں اور مشرقی ایشا کی زبانوں کے قواعد میں ہم آہنگی پر بحث کی،

(۱۹) ڈاکٹر عبدالکریم جرمانوس (پیدائش ۱۸۸۴ء) (Germanus, J.) آپ بوداپسٹ
میں پیدا ہوئے، شروع ہی سے سامی زبانوں کا شوق تھا، چنانچہ بوداپسٹ معہد کے دو [illegible] اساتذہ
اور غولدصیہر سے یہ زبانیں حاصل کیں، اور ان ہی دونوں اساتذہ کی تعلیم و تربیت سے اسلامی اور مشرقی علوم
فنون کا ذوق پایا، بوداپسٹ سے نکلنے کے بعد ۱۹۰۵ء تک استنبول اور وائنا کی یونیورسٹیوں میں مشرقیات
کی تعلیم حاصل کرتے رہے، ۱۹۰۶ء میں ادب عثمانی پر جرمنی زبان میں کتاب لکھی، نیز ترکی کی فتح کے بعد ہنگری
کی یونیورسٹیوں کی تاریخ لکھی، اور ایک مدت تک لندن کے برطانوی میوزیم میں رہ کر ترکی زبان کے قدیم
نصوص کی تحقیق کی، ۱۹۱۲ء میں بوداپسٹ آئے اور اس کے معہد میں مشرقی زبانوں کے استاد مقرر کیے گئے
جہاں انھوں نے اسلامی فکر اور عربی ترکی زبانوں کی تعلیم دی، اور امم اسلامیہ کی تاریخ کو اپنا موضوع قرار
دیکر انکے قدیم نفسیات اور جدید اجتماعی نہضت کے باہمی تعلقات پر بحث کی۔

ٹیگور نے آپ کو ہندوستان آنے کی دعوت دی، آپنے دعوت قبول کرکے ۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۲ء تک

دہلی، لاہور اور حیدرآباد کی یونیورسٹیوں میں تعلیم دی، اسی زمانہ میں دہلی کی جامع مسجد میں اپنے اسلام کا
اعلان کیا، اور ۱۹۳۰ء میں "اسلام میں جدید تحریکات" نامی کتاب شائع کی، نیز ۱۹۳۱ء میں جدید ادب ترکی
اور ۱۹۳۳ء میں "اسلامی تاریخ میں ترکوں کا زمانہ" شائع کی۔

ڈاکٹر صاحب قاہرہ بھی گئے، جہاں جامع ازہر میں دقت نظر کے ساتھ اسلامی علوم کو حاصل کیا، پھر
وہاں سے حرمین شریفین گئے اور حج و زیارت سے مشرف ہوئے، اور اپنے اس حج کے احوال و کوائف
"اللہ اکبر" نامی کتاب میں متعدد زبانوں میں شائع کیے۔

۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۱ء تک قاہرہ اور سعودی عرب میں رہکر علمی تحقیقات کرتے رہے، اور نتیجہ کے
طور پر ادب عربی کی بلندیاں اور عربی زبان کی تراکیب نامی کتابیں شائع کیں، ۱۹۵۵ء میں حکومت مصر
کی دعوت پر چند ماہ قاہرہ اور اسکندریہ میں گذارنے کے لیے آئے، نیز دمشق آئے تاکہ فکر عربی اور موجود
ادب عربی اور ادب مجری پر لکچر دیں، اس کے بعد ۱۹۵۶ء میں مشہور شاعر ابن الرومی اور اس کے افکار
پر کتاب لکھی [illegible] ۱۹۵۹ء میں ابن الرومی کے مجموعۂ اشعار کا جرمن زبان میں ترجمہ شائع کیا، ۱۹۵۸ء
میں عرب کے مشرقی علاقوں کا سفر کیا تاکہ عروبت کی تحریک، جدید عربی ادب، اور موجودہ ادبا، کے
بارے میں معلومات فراہم کریں، ۱۹۵۳ء میں اٹلی کی علمی اکیڈمی کے اور ۱۹۵۶ء میں قاہرہ کی المجمع اللغوی
کے ممبر منتخب کیے گئے،

تقریباً دو سال ہوئے ڈاکٹر عبدالکریم صاحب دوبارہ ہندوستان تشریف لائے تھے، اور مختلف تعلیمی اداروں
میں اسلامیات اور دوسرے عنوانات پر معلوماتی لکچر دیے، الحمدللہ آپ بقید حیات ہیں اور علمی و دینی کاموں میں مشغول ہیں۔

(۲۱) غیولا نیمث (پیدائش ۱۸۹۰ء) (Nemeth, G) بوداپسٹ یونیورسٹی میں ترکی علوم کی
تحصیل کی، اور اس میں ترکی تاریخ کے پروفیسر مقرر کیے گئے، نیمث کی تصنیفات میں "عثمانی دور حکومت میں
مجر کی تاریخ" ہے۔

(۲۱) دی شوموجی (پیدائش ۱۸۹۹ء) Somogyi, J.D. ، بوداپسٹ میں پیدا ہوئے اور استا
غولدصیہر سے بوداپسٹ یونیورسٹی میں سامی زبانوں کی تعلیم حاصل کی، اسکے بعد ڈاکٹر عبدالکریم جرمانوس سے پڑھا
اور اپنی علمی کاوش کو اسلامی تاریخ میں محدود کیا، اس میں اتنی ترقی کی کہ عرب مورخین کے ہم نگاہ بنگئے، ۱۹۳۱ء
میں امام ابن جوزیؒ کی کتاب المنتظم کی تلاش وتحقیق میں لندن گئے، اس سے پہلے اسکی تکمیل کے لیے یورپ کے
مختلف بلاد وامصار کا سفر کیا، اس کتاب کی بارہ جلدیں یورپ، قاہرہ اور قدس کے مختلف کتبخانوں
میں بکھری پڑی ہیں، دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد میں بڑی تلاش وجستجو کے بعد ۱۳۵۵ھ سے ۱۳۵۹ھ
تک اسکی پانچویں جلد سے دسویں جلد تک چھپ سکی، نیز شوموجی نے اس سفر میں کمال الدین دمیریؒ کی کتاب
حیاۃ الحیوان کے ماخذ ومصادر کی تلاش کی، غولدصیہر نے اس کام کو شروع کیا تھا، شوموجی فی الحال ولا
متحدہ امریکہ کی ہارورڈ یونیورسٹی کے کتبخانہ میں کام کرتے ہیں اور اسلام کی تمدنی تاریخ کے نگراں ہیں،

(۲۲) لاسلو راشونی (پیدائش ۱۸۹۹ء) Rasonyi, L. بوداپسٹ یونیورسٹی میں تعلیم
پائی، ترکی علوم میں تخصص حاصل کیا، اور انگورہ یونیورسٹی میں ۱۹۳۴ء سے ۱۹۴۱ء تک [illegible] رہے، اسکے بعد
ہنگری کے مجمع علمی کے شرقی شعبہ کے ذمہ دار بنائے گئے، موصوف نے ترکی زبان کے اصول وقواعد پر متعدد مباحث لکھے ہیں

(۲۳) سیغموند تلغدی (پیدائش ۱۹۰۹ء) Telegdi, Z. - بوداپسٹ، برسلاؤ اور
پیرس کی یونیورسٹیوں میں شرقی زبانوں کی تعلیم حاصل کی، اور بوداپسٹ یونیورسٹی میں فارسی زبان وادب کے
پروفیسر مقرر کیے گئے، مجلہ ایشیا میں فارسی ادب کا تعلق شرقی زبانوں سے" کے موضوع پر سلسلۂ بحث شروع کیا

(۲۴) کاروی تیبو لیدی (پیدائش ۱۹۱۴ء) Tzivedy. K. - لیڈن اور
بوداپسٹ کی یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کی اور بوداپسٹ یونیورسٹی میں سامی زبانوں کے پروفیسر بنائے گئے
مجر کی قدیم تاریخ میں عربی زبان کی بحث پر ماہرین لغات کی تحقیقات میں حصہ لیا، موصوف نے ابن فضلان
اور خوارزمی کے سفرناموں پر ایک رسالہ لکھا، اور انگریزی زبان میں قدیم مجریوں کی تاریخ کے مباحث لکھے ہیں

مطبوعاتِ جدیدہ

مکتوبات خواجہ محمد معصوم سرہندیؒ - از مولانا نسیم احمد صاحب امروہوی، صفحات ۳۰۰،
کتابت وطباعت عمدہ، ناشر ادارۂ الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ، قیمت للعہ

خاصان خدا کے ملفوظات ومکتوبات بعد زمانی کے باوجود ان کی صحبت ومعیت کی تاثیر رکھتے ہیں، انکے
پڑھنے سے نہ صرف ایمان میں تازگی پیدا ہوتی ہے بلکہ دل میں خدا اور اس کے رسول کی محبت و
عشق کی کیفیت، آخرت طلبی اور دنیا کی حقارت بھی پیدا ہوتی ہے جو رہروانِ راہِ عزیمت کی
سب سے قیمتی زاد ہے، جن بزرگوں کے مکتوبات اپنی افادیت اور تاثیر میں شہرت دوام رکھتے ہیں،
ان میں شرف الدین یحییٰ منیری اور شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی رحمہما اللہ کے مکتوبات کو
ایک خاص امتیاز حاصل ہے،

حضرت مجددؒ کے بعد ان کے صاحبزادگان میں حضرت خواجہ محمد معصوم ان کے علوم ومعارف
کے سب سے بڑے شارح اور حامل ہوئے ہیں، خواجہ صاحب نے بھی اپنے مکتوبات کے ذریعہ بیشمار بندگان خدا
کو اپنے "نفسِ گرم" کی تاثیر سے متاثر کیا اور ان کو راہ حق دکھائی، زیر تبصرہ کتاب ان ہی کے
منتخب مکاتیب کا اردو ترجمہ ہے، مکاتیب کی ترتیب اور ترجمہ کی سعادت مولانا نسیم صاحب
امروہوی کے حصہ میں آئی ہے، جن کو خانوادۂ مجددیہ سے عشق اور اس کے تراث علمیہ سے بڑی اچھی
واقفیت ہے،

خواجہ صاحب نے اپنے مکتوبات میں زیادہ تر خواص علماء اور امراء کو مخاطب کیا ہے،

ایک طرف وہ حضرت عالمگیر اور ارکان دولت کو بدعات اور جاہلی اثرات کے مٹانے اور اتباعِ سنت پر آمادہ کرتے ہیں تو دوسری طرف علما، اور صلحاے امت کو دعوت حق کے لیے ابھارتے اور ان کے منصب کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ان مکاتیب میں خواجہ صاحب نے بہت سے پیچیدہ مسائل کو بڑے سادہ انداز میں سلجھانے کی کوشش کی ہے۔ ان کے پڑھنے سے صاحب مکتوبات کی عزیمت اور نفس گرم کی حرارت کا اندازہ بھی ہوتا ہے، اور اپنے دل کی سرد مہری کے لیے گرمی عشق کا سامان بھی میسر آتا ہے۔ ان کے ایک ایک جملہ سے خدا کی محبت، اتباعِ سنت اور احیاے دین کا ولولہ اور اس کے لیے جسم و جان قربان کر دینے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، مولانا نسیم امروہوی اور ادارۂ الفرقان مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے مادیت کی ماری ہوئی اس دنیا کے لیے اطمینان قلب اور سکون طبیعت کا ایک ذخیرہ فراہم کر دیا، رجالِ مکتوبات کے سلسلہ میں مترجم نے جو قیمتی مواد فراہم کیا ہے، اس کے لیے وہ مزید تحسین کے مستحق ہیں، یہ کتاب ہر مسلمان گھر میں رکھنے کے لائق ہے۔

اسلام اور عدل و احسان۔ از رئیس احمد جعفری، صفحات ۳۹۱، کتابت و طباعت عمدہ، ناشر ادارۂ ثقافت اسلامیہ، لاہور، قیمت: ۶ ر

اسلام کے بارے میں غیر مسلموں میں عام طور پر جو غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں، ان میں یہ بھی ہے کہ وہ غیر روادار اور دوسروں کے لیے غیر منصفانہ دین ہے، یا اس میں جبر و تشدد کا غلبہ ہے، لیکن یہ غلط فہمی جتنی عام ہے اتنی ہی غلط اور بے بنیاد ہے، یہ ٹھیک ہے کہ وہ اپنے اصول اور عقیدے یا حقوق اللہ میں کوئی لچک قبول نہیں کرتا، لیکن اسی کے ساتھ یہ بات بھی اچھی طرح ذہن نشین کر لینے کی ہے کہ اسلام کے اصول اور عقیدے نرے ماوراے طبعی تصورات نہیں ہیں، بلکہ ان کا سررشتہ انسانی حقوق اور اس کی تمام ہی نازک ذمہ داریوں سے جڑا ہوا ہے، وہ ان ہی عقیدوں

اور اصولوں کی بنیاد پر تمام بندگانِ خدا سے معاملہ کرتا ہے وہ اگر خدا کے بارے میں یہ عقیدہ دیتا ہے کہ وہ رحیم و کریم، عادل و محسن ہے تو اسی کے ساتھ اپنے ماننے والوں کو یہ حکم بھی دیتا ہے کہ تخلقوا باخلاق اللہ اللہ کے اخلاق اپنے اندر پیدا کرو، وہ کہتا ہے الخلق عیال اللہ تمام مخلوق خدا کی عیال ہے،

اس کتاب میں مصنف نے دکھایا ہے کہ اسلام نے زندگی کے ہر گوشہ اور ہر شعبہ کو کس طرح برکتوں اور رحمتوں سے نوازا ہے، اور اس نے انسانی حقوق و فرائض کے لیے نہ صرف عادلانہ بلکہ محسنانہ بہترین نظام پیش کیا ہے۔ کتاب میں کل ۳۷ ابواب ہیں، جن میں اس موضوع کے ہر گوشہ پر گفتگو کی گئی ہے، اگر ابتدائی ابواب کے بجائے آخری ابواب میں زیادہ وضاحت ہوتی تو یہ کتاب اور زیادہ مفید ہوتی، پھر بھی یہ کتاب مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں کو مطالعہ کرانے کے لائق ہے۔

سندھ میں جدید اردو شعراء۔ از شان علی جعفری، صفحات ۲۷۶، طباعت ٹائپ کی، ناشر: ظہیر سنز سر گھاٹ روڈ، حیدر آباد سندھ۔

اس میں سندھ کے موجودہ دور کے تقریباً ۴۴ شاعروں کے حالات زندگی اور ان کے کلام کے نمونے پیش کیے گئے ہیں، ان میں بیشتر شعرا کی شہرت سندھ اور اس کے ملحقہ علاقوں تک محدود ہے، لیکن ان کے کلام سے اردو کی ہمہ گیری کا اندازہ ہوتا ہے، کتاب کے شروع میں ایک پر مغز مقدمہ مرتب کے قلم سے ہے، جس میں سندھ میں اردو ادب کی جدید و قدیم تاریخ بیان کی گئی ہے، سندھ میں اردو شاعری کا رواج کئی صدی سے ہے اور اس لیے انھوں نے پانچ ادوار قائم کیے ہیں، مولانا سید سلیمان ندوی رحمہ اور پیر حسام الدین راشدی صاحب وغیرہ نے آج سے بہت پہلے اپنے مقالات میں یہ تحقیق پیش کی تھی کہ اردو کے ابتدائی نشو و نما میں سرزمین سندھ کو اولیت حاصل ہے، اس لیے کہ عربوں اور ایرانیوں کے قافلے سب سے پہلے یہیں آئے اور ان کے میل جول سے ایک نئی زبان نے جنم لینا شروع کیا، مؤلف کتاب نے اس کی مزید وضاحت کی ہے، کتاب اور اس کا مقدمہ خاص طور پر مطالعہ کے لائق ہے۔

مجربات فخر الاطباء۔ مرتبہ حکیم محمد جلال الدین مرحوم، صفحات ۱۱۶، کتابت وطباعت معمولی، ناشر: ادارۃ اشاعت علوم اسلامیہ، حسین آگاہی، ملتان۔

اس میں بدن کے تمام اعضاء اور امراض کے بارے میں وہ مجرب نسخے درج ہیں جن کو حکیم فقیر محمد حسن مرحوم اپنے مریضوں پر بار بار تجربہ کر چکے ہیں، ان نسخوں میں جو دوائیں تجویز کی گئی ہیں، ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ بہت ہی مختصر، کم قیمت اور آسانی سے دستیاب ہو جانے والی ہیں، کتاب کے شروع میں حکیم صاحب مرحوم کے کچھ بیش قیمت اقوال بھی ہیں جن سے اطبا فائدہ اٹھا سکتے ہیں، اور اسباب کے علاوہ ان حکیمانہ باتوں کے نظر انداز کر دینے کی وجہ سے بھی یونانی طریقۂ علاج غیر مؤثر اور غیر مقبول ہوتا جا رہا ہے، اس کتاب سے اطبا کو پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہیے۔

معیت الٰہیہ۔ از مولانا شاہ عبد الغنی صاحب پھولپوری، صفحات ۹۴، کتابت وطباعت بہتر، پتہ: ناظم خانقاہ اشرفیہ ۱۲ سب بلاک جی ناظم آباد ۱۲ کراچی ۱۸۔

مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کی ذات گرامی سے اس صدی میں امت کو جو غیر معمولی فائدہ پہنچا اس میں انکی تحریروں کے ساتھ ان کے خلفاء کا بھی بڑا حصہ ہے، ان کے اکابر خلفا میں ایک ممتاز شیخ مولانا عبد الغنی صاحب پھولپوری بھی ہیں، وہ ایک دیہات میں بیٹھکر دین کی ترویج واشاعت کا کام کرتے رہے، انکی ذات سے اعظم گڈھ اور اسکے اطراف وجوانب کے مسلمانوں کو بڑا فائدہ پہنچا، اب وہ کچھ دنوں سے کراچی میں مقیم ہیں، وہاں انھوں نے مختلف مجالس میں معیت الٰہیہ کے موضوع پر جو حکیمانہ باتیں فرمائی تھیں انہی ملفوظات کو بعض قدر دانوں نے جمع کر کے شائع کر دیا ہے، اس رسالہ میں بتایا گیا ہے کہ تعلق باللہ اور قرب خداوندی کے حصول کے لیے محض ذکر وفکر کافی نہیں ہے بلکہ اس کیلئے اہل اللہ کی صحبت بھی ضروری ہے، اس بات کو مولانا نے بڑے حکیمانہ اور والہانہ انداز میں بیان کیا ہے، جابجا صحابہ کرام کے واقعات، بزرگوں کی حکایات اور مولانا روم کے اشعار نے اس میں مزید تاثیر پیدا کر دی ہے، یہ کتاب علما اور خاص طور پر اس راہ کے رہروں کیلئے بڑی مفید ہے، معیت الٰہیہ کا ترجمہ کرنے کی ضرورت نہیں تھی، اگر اس کا ترجمہ کیا گیا تھا تو اسکا لفظی ترجمہ "خدائی ساتھ" کے بجائے اللہ کی قربت یا قرب خداوندی وغیرہ کرنا چاہیے تھا۔

م، ج

جلد ۸۸ ماہ صفر المظفر ۱۳۸۱ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۶۱ء عدد ۲

مضامین